ماہنامہ
اکتوبر 2024ء
طلوعِ اسلام
لاہور
اشاعت کا اسی واں سال
قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ (الحدیث)
حضرت محمد ﷺ کے بعد نبوت کا ہر دعویٰ باطل ہے



علامہ اقبالؒ کے ایماء اور قائداعظمؒ
کی خواہش پر 1938ء سے شائع
ہونے والا ماہنامہ

نظام کی پیدا کردہ بھوک کبھی صدقہ، خیرات، فری دسترخوان، این جی اوز اور ویلفیئر ٹرسٹ سے ختم نہیں کی جا سکتی۔ اس کا حل صرف قرآن کے نظامِ ربوبیت میں ہے۔



بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پرویز صاحب کے علمی اسلوبِ تحقیق کی تائید

قرآنی نظریات کی روشنی میں مغرب کے غلط تصورات کی تردید میں محترم پرویز اور ہمارے ہاں کے مفکرین نے بہت کچھ لکھا ہے۔ ان میں سے ڈاکٹر علامہ اقبالؒ، ڈاکٹر رفیع الدین احمد اور ڈاکٹر برہان احمد فاروقی کی تصنیفات سے چند اقتباسات پیش کئے جا رہے ہیں۔ جب بھی قارئین ان اقتباسات کی روشنی میں محترم پرویز صاحب کی تصنیفات کا جائزہ لیں گے تو وہ ان تمام خوبیوں کو بشمول دیگر خوبیوں کے ان میں پائیں گے۔ اس موضوع پر محترم پرویز صاحب کا موقف جاننے کے لئے خصوصی طور پر ان کی تصانیف ''انسان نے کیا سوچا'' اور ''اسلام کیا ہے'' ملاحظہ فرمائی جا سکتی ہیں۔

(1) ڈاکٹر علامہ اقبالؒ کا موقف:

1- عقل اور وحی میں تصادم نہیں بلکہ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔

2- قرآن سے راہنمائی حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ:

(الف) اپنے زمانوں کے تقاضوں اور اپنے دور کی فکری کاوشوں سے متعارف ہوں۔

(ب) قرآن کریم کو عربی زبان اور تصریفِ آیات کی رو سے سمجھنا چاہئے اور اس پر خارجی عناصر کو اثرانداز نہیں ہونے دینا چاہئے۔

(2) ڈاکٹر محمد رفیع الدین کا موقف:

مغرب کے غلط فلسفیانہ تصورات کی تردید قرآنی نظریات سے کرتے ہوئے مصنف کے لئے ضروری ہے کہ:

1- وہ روحِ قرآن کے ساتھ پوری پوری واقفیت پیدا کریں جس کے بغیر قرآنی اور غیر قرآنی تصورات میں تمیز کرنا مشکل ہوگا۔

2- وہ مغرب کے غلط تصورات کے اصل ماخذ اور ان کے متبعین کے طرزِ خیال و عمل سے پوری پوری واقفیت پیدا کریں۔

3- وہ علم کے تمام شعبوں سے یعنی مادی، حیاتیاتی اور نفسیاتی علوم اور فلسفہ سے جو ان علوم کو جمع کر کے ایک مکمل نظریہ کائنات ترتیب دیتا ہے، اس حد تک واقف ہوں کہ ان کی ساری وسعت میں جہاں کہیں کوئی اسلامی تصور موجود ہو اسے پہچان کر لے سکیں اور استخراج اور استنباط سے مزید صحیح اسلامی تصورات کو اخذ کر سکیں۔

بقیہ صفحہ نمبر 66 پر

ماہنامہ
طلوعِ اسلام
لاہور
اکتوبر 2024ء

جلد 77 | شمارہ نمبر 10

اس شمارے میں

عنوان	مصنف	صفحہ نمبر
لمعات: عوامی مسائل کا حل اور حضرت عمرؓ	ادارہ	4
تشکیلِ اُمتِ واحدہ	علامہ غلام احمد پرویز علیہ الرحمہ	5
قرآن کریم سمجھنا نہایت آسان	آصف جلیل، لاہور	21
علامہ اقبالؒ اور مولانا مدنیؒ	پروفیسر فتح محمد ملک	24
فکرِ پرویز۔۔۔ایک مختصر ترین تاثر	جمیل احمد عدیل	34
برقی توانائی کا بحران یا منصوبہ بندی کا فقدان	ابوانیس فاروقی، کینیڈا	41
قرآن کے نظامِ عدل کے چند بنیادی اصول	ڈاکٹر انعام الحق، اسلام آباد	46
قرآن اور انسانی عقل	ڈاکٹر اعجاز رسول، یوکے	54

ENGLISH SECTION

Manzil ba Manzil (منزل بہ منزل)
Chapter 4: Builder of Kaaba (*Mei'mar Haram* - معمارِ حرم) – 60
To leaders of Spring's caravan
(Tulu-e-Islam Convention, April, 1960) By G. A. Parwez

چیئرمین: خورشید انور

مجلسِ ادارت
ڈاکٹر انعام الحق، ڈاکٹر اعجاز رسول
اقبال ادریس ایڈووکیٹ

مدیر انتظامی: محمد سلیم اختر

قانونی مشیر: ملک محمد سلیم ایڈووکیٹ

ادارہ کا مضمون نگار کی تحریر سے کُلّی اتفاق ضروری نہیں۔

زرِتعاون: 50 روپے فی پرچہ
پاکستان: 600 روپے سالانہ
رجسٹرڈ ڈاک: 1000 روپے سالانہ

ادارہ طلوعِ اسلام B-25 گلبرگ 2، لاہور 54660، (پاکستان)
Phone: 042-35714546
Cell: +92 310-4800818
Cell: +92 318-2221851
idarati@gmail.com www.facebook.com/Talueislam

Bank Account Idara Tolu-e-Islam
National Bank of Pakistan, Main Market Branch Gulbarg Lahore
For Domestic Transactions
Bank A/C No: 0465004073177672
For International Transactions
IBAN:PK36NBPA0465004073177672
Swift Code: NBPAPKKAA02L

ادارہ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ) کی مطبوعات سے حاصل شدہ جملہ آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صَرف کی جاتی ہے

ناشر: عرفان راٹھور اشتیاق اے مشتاق پرنٹرز سے چھپوا کر B-25، گلبرگ II لاہور سے شائع کیا

طلوعِ اسلام

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں
کوئی اندازہ کرسکتا ہے اُس کے زورِ بازو کا!
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں
ولایت، پادشاہی، علم اشیا کی جہاں گیری
یہ سب کیا ہیں، فقط اک نکتۂ ایماں کی تفسیریں
براہیمی نظر پیدا مگر مشکل سے ہوتی ہے
ہوس چھپ چھپ کے سینوں میں بنالیتی ہے تصویریں
تمیزِ بندہ و آقا فسادِ آدمیّت ہے
حذر اے چیرہ دستاں! سخت ہیں فطرت کی تعزیریں
حقیقت ایک ہے ہر شے کی، خاکی ہو کہ نوری ہو
لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرّے کا دل چیریں
یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں
چہ باید مرد را طبع بلندے، مشرب نابے
دلِ گرمے، نگاہِ پاک بینے، جانِ بیتابے

(بانگِ درا۔ علامہ اقبالؒ)

(جاری ہے)

ادارہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

عوامی مسائل کا حل اور حضرت عمرؓ

یوں تو وہ کونسا دَور ہے جس میں عوام کو مشکلات کا سامنا نہیں کرنا پڑا، لیکن آج کل ان کی کثرت اور شدّت بہت زیادہ ہوگئی ہے۔ آپ کسی شخص سے ملئے اور کسی وقت ملئے، اس کے لبوں پر سب سے پہلے حرفِ شکایت آئے گا۔ شکایت بھی ملک اور قوم کے استحکام یا مستقبل سے متعلق نہیں۔ روز مرّہ کی زندگی میں قدم قدم پر پیش آنے والے معاملات سے متعلق ___ اور ان کا حل نہ کہنے والے کے پاس ہوگا، نہ سننے والے کے پاس۔ دونوں اس باب میں بے بس نظر آئیں گے۔ یہ حالت سارے کے سارے معاشرہ کی ہوچکی ہے۔ اخبارات اور محکمہ جات نے ''شکایات سَیل'' کھول رکھے ہیں جن کے صفحات شکایات سے بھرے نظر آئیں گے لیکن ان مشکلات کا حل کہیں دکھائی نہیں دے گا۔ اس کا اصولی حل، حضرت عمرؓ نے عملاً پیش فرمایا تھا۔ واقعہ تو وہ انہی کے دور کا ہے لیکن جو مثال آپؓ نے قائم کی تھی وہ ہر دور میں ابدی اصول کا کام دیتی ہے۔ ہوا یوں کہ ملک میں قحط پڑ گیا اور ارد گرد کی ساری آبادیاں ہجوم کر کے مدینہ آ گئیں ___ اس مشکل کے حل کے لیے آپؓ نے ایک تدبیر یہ اختیار کی حکم دے دیا کہ مدینہ میں کسی کے گھر میں انفرادی طور پر کچھ نہیں پکے گا۔ ساری غذا یکجا کر لی جائے گی جسے اہلِ مدینہ اور بیرونی پناہ گزین ایک دسترخواں پر مل کر کھائیں گے۔ اس کی ابتداء آپؓ نے خود اپنے گھر سے کی۔ یہ غذا جس قسم کی ہوسکتی تھی ظاہر ہے۔ آپؓ اس کے عادی نہیں تھے ___ مسلسل پریشانی، پیہم مشقت، دن رات کی تگ وتاز۔ اس پر ناموافق غذاء، نتیجہ یہ کہ آپؓ کے چہرے کا رنگ سیاہ پڑ گیا اور دن بدن لاغر ہوتے چلے گئے۔ اس پر آپؓ کے رفقاء کو تشویش لاحق ہوئی اور انہوں نے آپ سے کہا کہ آپؓ اس تبدیلیٔ غذاء کو برداشت نہیں کر سکیں گے اس لئے آپ اپنے معمول کی غذاء کی طرف پلٹ آیئے۔ اس کے جواب میں آپ نے جو کچھ فرمایا: وہ ابدی اصول ہے جس میں عوام کی مشکلات کا حل پوشیدہ ہے۔ آپؓ نے فرمایا:

مجھے لوگوں کی تکالیف کا احساس کس طرح ہوسکتا ہے جب تک مجھ پر بھی وہی کچھ نہ گذرے جو ان پر گزرتی ہے۔

(شاہکارِ رسالت، ص:257)

سوچئے کہ جن اربابِ اقتدار کے کھانے کے میز پر صبح شام، تازہ بتازہ، خالص، انواع واقسام کی اشیائے خورونوش بافراط موجود ہوں، انہیں کس طرح احساس ہوسکتا ہے کہ عوام زندگی کے دن کیسے پورے کر رہے ہیں ؎

تو اے کبوترِ بامِ حرم چہ می دانی　　تپیدنِ دل مرغانِ رشتہ بر پارا!

(اے حرم کی چھت پر (آزاد) بیٹھے ہوئے کبوتر تو کیا جانے کہ ان پرندوں کے دل کی تڑپ کیا ہوتی ہے جن کے پاؤں بندھے ہوئے ہوتے ہیں۔ س،ا)

کہا جا سکتا ہے کہ اربابِ اقتدار کو عوام کی ان مشکلات کا علم تو ہوتا ہے! علم ہونے کے باوجود، ان کا تدارک کیوں نہیں ہوتا، یہ جُداگانہ موضوع ہے۔ ہم اس وقت اپنے آپ کو اسی نکتہ تک محدود رکھنا چاہتے ہیں جسے حضرت عمرؓ نے پیش فرمایا تھا۔ علم تو انہیں بھی تھا کہ قحط زدگان کو کس قسم کا کھانا مل رہا ہے، لیکن انہوں نے ان کے ساتھ شریکِ دسترخوان ہونا ضروری سمجھا تاکہ انہیں ذاتی تجربہ اور احساس ہوجائے کہ اس سے ان پر گزرتی کیا ہے۔ اسی سے ان کی مشکلات کا تدارک ہوسکتا تھا اور اسی طرح اسلامی نظام وجود میں آسکتا اور قائم رہ سکتا تھا۔

غلام احمد پرویزؒ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

تشکیلِ اُمتِ واحدہ

قرآن نے دین کو مکمل کر دیا اور اس کے بعد مسلمانوں سے کہہ دیا کہ تمہارا شعار زندگی اب یہ ہے کہ وَاعۡتَصِمُوۡا بِحَبۡلِ اللّٰہِ جَمِیۡعًا وَّلَا تَفَرَّقُوۡا ۔۔۔ (3:103)- تم سب کے سب مل کر اس ضابطہ خداوندی کو محکم طور پر تھامے رہو اور فرقوں میں مت بٹ جاؤ۔

یہ ہے دین کا اصل الاصول۔ اسی میں تمہاری فلاح و بہبود کا راز مضمر ہے اور اسی سے خود دین کا (یعنی اس نظام زندگی کا جو تمہارے لئے تجویز کیا گیا ہے) قیام، تمکن اور استحکام وابستہ ہے۔ اس آیہ جلیلہ کے مختلف الفاظ پر غور کیجئے۔ حقیقت ابھر کر سامنے آتی جائے گی۔ سب سے پہلے یہ کہ بِحَبۡلِ اللّٰہِ ایک ہے۔ ایک سے زیادہ نہیں۔ دین کا ضابطہ قرآن ہے اور یہی وہ بِالۡعُرۡوَۃِ الۡوُثۡقٰی ۔ (2:256)- وہ محکم سہارا ہے، جو کبھی ٹوٹ نہیں سکتا۔ لَا انۡفِصَامَ لَہَا ؕ- (2:256) کبھی دغا نہیں دے سکتا۔ جو ہر زمانے میں، ہر مقام پر، تمام نوع انسانی کے لئے واحد اور مکمل ضابطہ حیات ہے۔ ذہن انسانی کے وضع کردہ نظام زندگی زمانے کے تقاضوں کے بدلنے سے ٹوٹتے اور بنتے، بنتے اور ٹوٹتے رہتے ہیں۔۔۔ زماں زماں شکند آنچہ می تراشد عقل۔۔۔ لیکن یہ ضابطہ خداوندی زمان اور مکان کی نسبتوں سے بلند اور حدود و قیود کے امتیازات سے ماوراء ہے۔ اس کے اصول، زندگی کی وہ ابدی اور مستقل اقدار ہیں جن میں کبھی تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا۔ لَا تَبۡدِیۡلَ لِکَلِمٰتِ اللّٰہِ ؕ ۔۔۔ (10:64)۔

دین اجتماعی ہے:

(2) وَاعۡتَصِمُوۡا (3:103)- میں جمع کے صیغے (تم سب) اور جَمِیۡعًا کی تخصیص سے یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ دین، خدا اور بندے کے درمیان انفرادی تعلق کا نام نہیں کہ ہر شخص اپنی اپنی جگہ بیٹھے، اپنے اپنے انداز سے ''گیان دھیان'' کے ذریعے خدا سے لو لگا لے اور اس طرح اپنی ''مکتی'' (نجات) کا سامان پیدا کر لے۔ دین، اجتماعی نظام زندگی کا نام ہے۔ جس میں تمام افراد ایک ناقابل تقسیم وحدت کی حیثیت سے رہتے اور ایک طریق پر چلتے ہیں۔ ان کی وجہ جامعیت بھی دین کا اشتراک ہے۔ اسی سے یہ سب ایک امت بنتے ہیں۔ وَ کَذٰلِکَ جَعَلۡنٰکُمۡ اُمَّۃً وَّسَطًا ۔۔۔ (2:143)-

(3) جَمِیۡعًا نے اس حقیقت کو بھی واضح کر دیا ہے کہ اس دین کے مطابق زندگی اسی صورت میں بسر ہو سکتی ہے جب

پوری کی پوری امت ایک ہی طریق پر چل رہی ہو۔ اگر اس میں مختلف فرقے پیدا ہو گئے اور ہر فرقہ نے ایک جداگانہ طریق کی پیروی اختیار کر لی، تو یہ دین باقی نہیں رہ سکتا۔ لَا تَفَرَّقُوْا کے حکم نے اس حقیقت کو اور بھی نمایاں کر دیا۔ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا میں امر (حکم) تھا۔ یعنی یہ کرو اور لَا تَفَرَّقُوْا میں نہی ہے (کہ یوں نہ کرو) اور یہ ظاہر ہے کہ جس بات کو امر اور نہی۔ مثبت اور منفی کی حدوں میں گھیر کر بیان کیا جائے اس میں نہ کسی شک وشبہ کی گنجائش باقی رہتی ہے نہ مزید تاکید وتائید کی ضرورت۔ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ... (3:103)- ایک جامع اصول زندگی ہے جس میں کسی اختلاف یا استثناء کی قطعاً گنجائش نہیں۔

☆☆☆

یہ کوئی نیا اصول نہیں

(4) قرآن نے یہ بھی بتایا ہے کہ یہ کوئی نیا اصول زندگی نہیں جو تمہیں پہلی بار دیا جا رہا ہے۔ یہی اصول ہے جو پہلے دن سے آج تک ہر نبی کی وساطت سے دیا جاتا رہا ہے۔ شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰى ۔۔۔ (42:13)- اللہ نے اسی دین (نظام زندگی) کا راستہ تمہارے سامنے کھول دیا ہے جس کا حکم اس نے نوحؑ کو دیا تھا۔ وہی دین اب تمہاری طرف وحی کیا جاتا ہے۔ اسی کا حکم ابراہیمؑ اور موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو دیا گیا ہے۔

یہ حکم کیا تھا؟ یہی کہ اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ... (42:13)- تم سب اسی دین کو قائم کرنا اور اس میں کسی قسم کا تفرقہ نہ پیدا کر دینا۔ یہی وہ دین کی وحدت اور تفرقہ سے اجتناب تھا جس سے تمام انبیاء کرامؑ (زمان اور مکان کے اس قدر بعد اور اختلاف کے باوجود) ایک ''امت واحدہ'' بن گئے تھے۔ وَاِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوْنِ ﴿۵۲﴾ (23:52)- اے گروہ انبیاء! یہ تمہاری جماعت امت واحدہ ہے۔ تمہاری وجہ جامعیت یہ ہے کہ میں تم سب کا نشوونما دینے والا ہوں۔ لہٰذا تم صرف میرے قوانین کی نگہداشت کرنا۔

امت واحدہ

یہاں اس حقیقت کو نمایاں کیا گیا کہ امت کی وحدت، ضابطہ زندگی اور قانون حیات کی وحدت پر مبنی ہوتی ہے۔ جب تک دین ایک رہے گا، امت بھی ایک رہے گی۔ یا جب تک امت ایک ہوگی، اس کا دین بھی ایک ہوگا۔ جب امت میں تفرقہ پڑ جائے گا تو دین بھی ایک نہیں رہے گا۔ الگ الگ ہو جائے گا۔ اور چونکہ دین ایک ناقابل تقسیم وحدت ہے اس لئے الگ الگ ''دین'' کے معنی یہ ہیں کہ اصل دین کہیں باقی نہیں رہا۔

(5) کسی امت (قوم۔ جماعت) میں تفرقہ پیدا کر دینا کتنا بڑا جرم ہے اس کا اندازہ اس واقعہ سے لگائیے جسے خدا نے سورہ طٰہٰ میں بیان کیا ہے۔ حضرت موسیٰؑ کچھ دنوں کے لئے باہر تشریف لے جاتے ہیں اور بنی اسرائیل کو حضرت ہارونؑ

کی زیرنگرانی چھوڑ جاتے ہیں۔ جب آپ واپس آتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ قوم نے گئوسالہ پرستی اختیار کر رکھی ہے۔ اس کا جو اثر حضرت موسیٰؑ کی طبیعت پر ہوسکتا تھا۔ ظاہر ہے۔ وہ غصے سے لال پیلے ہوجاتے ہیں اور اپنے بھائی سے پوچھتے ہیں کہ: مَا مَنَعَكَ اِذْ رَاَيْتَهُمْ ضَلُّوْٓا ﴿۹۲﴾ (20:92)- ''جب تم نے دیکھا تھا کہ یہ لوگ گمراہ ہو رہے ہیں' تو وہ کونسی بات تھی جس کی وجہ سے تم نے انہیں (اس روش سے) روکا نہیں''؟ اب سنئے کہ حضرت ہارونؑ اس کا کیا جواب دیتے ہیں۔ یاد رہے کہ حضرت ہارونؑ بھی خدا کے رسول ہیں۔ وہ جواب میں کہتے ہیں کہ: اِنِّىْ خَشِيْتُ اَنْ تَقُوْلَ فَرَّقْتَ بَيْنَ بَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ وَلَمْ تَرْقُبْ قَوْلِىْ ﴿۹۴﴾ (20:94)- ''مجھے یہ اندیشہ گذرا کہ تو آ کر یہ نہ کہہ دے کہ (اے ہارونؑ) تو نے بنی اسرائیل میں تفرقہ ڈال دیا اور میرے فیصلے کا بھی انتظار نہ کیا۔''

شرک سے بھی بڑھ کر

آپ نے سوچا برادران! کہ یہ بات کیا ہوئی؟ حضرت ہارونؑ نے کہا کہ اگر یہ لوگ جہالت کی وجہ سے کچھ وقت کے لئے مورتی کی پوجا کرنے لگ گئے تھے تو میرے نزدیک یہ اتنا بڑا جرم نہیں تھا جتنا بڑا جرم ان میں تفرقہ پیدا کر دینا تھا۔ یہ جواب ایک نبی کی طرف سے دیا جاتا ہے اور دوسرا نبی اس سے مطمئن ہوجاتا ہے جیسا کہ ذرا آگے چل کر بتایا جائے گا۔ قرآن نے خود فرقہ بندی (تفرقہ) کو شرک قرار دیا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ گئوسالہ پرستی بھی شرک تھی اور تفرقہ انگیزی بھی شرک لیکن تفرقہ انگیزی کا شرک ایسا شدید اور سنگین تھا کہ اس سے بچنے کے لئے عارضی طور پر گئوسالہ پرستی کے شرک کو گوارا کیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ قرآن اس پر شاہد ہے کہ گئوسالہ پرستی کے جرم کا ازالہ توبہ سے ہوگیا۔ فَتَابَ عَلَيْكُمْ ۭ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۵۴﴾ (2:54)- لیکن جب انہوں نے باہمی تفرقہ پیدا کرلیا اور اس طرح امت واحدہ کی بجائے مختلف گروہوں اور پارٹیوں میں بٹ گئے۔ وَقَطَّعْنٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اُمَمًا ۚ (7:168)- تو ان پر تباہی اور بربادی' ذلت وخواری' محرومی ومحتاجی کا ایسا عذاب مسلط ہوگیا جو ہر جگہ سائے کی طرح ان کے پیچھے لگا رہتا تھا۔ ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ اَيْنَ مَا ثُقِفُوْٓا ... (3:112)-

(6) جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے' ہر رسول کا پیغام یہ تھا کہ ''دین کو قائم کرو اور باہمی تفرقہ مت پیدا کرو۔'' ہر رسول اس پیغام کے ذریعے ایک جماعت' ایک امت متشکل کر کے جاتا۔ اس کی امت کچھ وقت تک تو متحد رہتی لیکن اس کے بعد اس میں گروہ بندیاں اور فرقہ سازیاں شروع ہوجاتیں۔ یہ کیوں ہوتا؟

قرآن اس کی وجہ بتاتا ہے کہ: وَمَا تَفَرَّقُوْٓا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَاۗءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ۭ ... (45:17,42:14)- یعنی خدا کی طرف سے العلم (وحی) آجانے کے بعد' جس کا مقصد تمام اختلافات کو مٹا دینا ہے' باہمی تفرقہ کی گنجائش ہی نہیں رہتی۔ لیکن اس وحی کے وارث' باہمی ضد اور ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانے اور ایک دوسرے پر چڑھ دوڑنے کے جذبہ کی وجہ سے مختلف فرقے بنا لیتے ہیں۔

فرقہ سازی کا جذبۂ محرکہ

یعنی اس گروہ بندی اور فرقہ سازی کی وجہ یہ نہیں تھی کہ انہیں دین کی کسی حقیقت کے سمجھنے میں غلطی لگ جاتی تھی۔ کوئی شق مشتبہ اور مبہم رہ جاتی تھی۔ خدا کی طرف سے دیئے ہوئے علم میں اشتباہ و ابہام کا کیا کام؟ یہ فرقہ سازی محض ہوس اقتدار کی تسکین کے لئے ہوتی تھی۔ ان میں سے جن لوگوں کے دل میں لیڈر بننے کا شوق چراتا وہ اپنا فرقہ الگ بنا لیتے' پھر ہر فرقہ' دوسرے فرقہ سے آگے نکل جانا اور اس پر غالب آ جانا چاہتا۔ اس سے باہمی کش مکش اور سر پھٹول شروع ہو جاتی اور یوں اس امت واحدہ کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے اور اس کے ساتھ ہی دین بھی اس تشتت و افتراق کے پردوں میں گم ہو جاتا۔ اس سے یہ حقیقت بھی ہمارے سامنے آ گئی کہ فرقہ بندی علم و بصیرت اور دلائل و براہین کی بناء پر وجود میں نہیں آتی۔ اس کی بنیاد جذبات پر ہوتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ہر فرقہ کے لوگ اپنے فرقہ کے برسرحق ہونے کے ثبوت میں دلائل پیش کرتے دکھائی دیتے ہیں اور وہ کونسا جذباتی فیصلہ ہے جس کی تائید میں عقل فسوں ساز دلائل مہیا نہیں کر دیتی؟

نزول قرآن کا مقصد

(7) نزول قرآن کے وقت دنیائے مذاہب کی یہی کیفیت تھی۔ (واضح رہے کہ دین تو ایک ہی ہوتا ہے لیکن جب فرقہ بندی میں اس کے ٹکڑے ہو جاتے ہیں تو انہیں مذاہب کہا جاتا ہے) قرآن نے اپنے نزول کا مقصد یہ بتایا ہے کہ وہ ان تمام اختلافات کو مٹا کر' خدا کا دین قائم کرے گا اور فرقوں اور گروہوں میں بٹے ہوئے انسانوں کو ایک امت واحدہ میں تبدیل کر دے گا۔ وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِي اخْتَلَفُوْا فِيْهِ... (16:64)- ''(اے رسول) تجھ پر یہ کتاب صرف اس لئے نازل کی گئی ہے کہ جن امور میں یہ لوگ باہمی اختلافات کرتے ہیں' تو ان کی وضاحت کر دے۔'' اس کے بعد' جو لوگ اس دین واحد کی صداقت کو تسلیم کر لیں گے' یہ کتاب انہیں زندگی کے صحیح راستے کی طرف راہنمائی کرے گی اور اس طرح ان کے لئے موجب رحمت بن جائے گی۔۔۔ وَهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ۝ (16:64)- ''یعنی تبیان حقیقت تو تمام انسانوں کے لئے یکساں ہو گی لیکن ہدایت اور رحمت صرف انہیں کے لئے ہو گی جو اس صداقت پر ایمان لے آئیں گے۔''

اس سے یہ حقیقت نکھر کر سامنے آ گئی کہ قرآن کا مقصد اولیں اختلافات کو مٹا کر دین کی وحدت کا قیام ہے اور اختلافات کا مٹ جانا خدا کی رحمت ہے۔ اسی نکتہ کی وضاحت دوسرے مقام پر ان الفاظ میں کر دی گئی کہ: وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّةً وَّاحِدَةً... (11:118)- ''اگر یہ مقصود ہوتا کہ تمام انسانوں کو مجبور کر کے ایک راستے پر چلایا جائے تو خدا کے لئے ایسا کرنا کچھ مشکل نہیں تھا۔'' اس نے جس طرح دیگر حیوانات کو اس انداز سے پیدا کیا ہے کہ ہر نوع کا فرد اپنی نوع اور جماعت کے ساتھ رہتا ہے۔ اس سے کبھی اختلاف نہیں کرتا (مثلاً تمام بھیڑیں ایک نہج سے زندگی گذارتی ہیں اور تمام شیر ایک ہی راستے پر چلتے ہیں)۔

علیٰ وجہ البصیرت وحدت

اسی طرح وہ انسانوں کو بھی جبلی طور پر ایک ہی راستے پر چلنے پر مجبور کر دیتا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ اس نے انسانوں کو فکر و عمل کی آزادی دے رکھی ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ چاہیں تو اتحاد اور اتفاق کی زندگی بسر کریں اور چاہیں تو تشتت و افتراق پیدا کر لیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی انہیں بتا دیا گیا ہے کہ تشتت و افتراق کی زندگی عذاب کی زندگی ہے اور ''ایک امت'' بن کر رہنے کی زندگی رحمت اور سعادت کی زندگی۔ لیکن یہ وحدت اسی صورت میں حاصل ہو سکتی اور قائم رہ سکتی ہے کہ تم اپنے دل کی رضامندی سے اور علیٰ وجہ البصیرت خدا کی کتاب کو اپنا ضابطہ حیات بنا لو۔ اگر تم نے ایسا کر لیا تو تم نے زندگی کے مقصد کو پا لیا۔ چنانچہ جو آیت اوپر درج کی گئی ہے اس کا اگلا حصہ یہ ہے وَّلَا یَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِیْنَ ﴿۱۱۸﴾ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ ط ... (11:119)- ان لوگوں کے سوا جو وحی کے مطابق زندگی بسر کرنے سے خدا کی رحمت کے سزاوار بن جائیں' باقی ایک دوسرے سے اختلاف کرتے رہیں گے حالانکہ انہیں پیدا اس لئے کیا گیا تھا کہ یہ (اپنی رضا و رغبت سے) امت واحدہ بن کر رہیں۔ وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ ط ... (11:118-119)-

اس آیت سے یہ حقیقت سامنے آ گئی کہ:

(الف) مقصود تخلیق انسانی یہ ہے کہ تمام انسان ایک امت (ایک عالمگیر برادری) بن کر رہیں اور باہمی اختلافات پیدا نہ کریں۔

(ب) یہ اختلافات صرف وحی خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنے سے مٹ سکیں گے۔ یہ زندگی رحمت کی زندگی ہے۔

(ج) جو لوگ وحی کے مطابق زندگی بسر نہیں کریں گے ان کے اختلافات مٹ نہیں سکیں گے یہ عذاب کی زندگی ہوگی۔

تفرقہ مت پیدا کر لینا

(8) ان حقائق کی وضاحت کے بعد مسلمانوں سے کہہ دیا گیا کہ: وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِیْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْبَیِّنٰتُ ط ... (3:105)- ''دیکھنا! تم بھی کہیں ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے خدا کی طرف سے واضح حقائق مل جانے کے بعد' فرقے بنا لئے اور آپس میں اختلاف کرنے لگ گئے۔'' وَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ﴿۱۰۵﴾ ... (3:105)- ''یہ لوگ جو فرقوں میں بٹ جاتے ہیں اور آپس میں اختلاف کرنے لگ جاتے ہیں' ان پر سخت عذاب مسلط کر دیا جاتا ہے۔'' اس کے بعد کی دو آیات میں قرآن نے بتایا ہے کہ اختلاف اور تفرقہ کی زندگی درحقیقت' ایمان کے بعد کفر کی زندگی ہے اور روسیاہی کا موجب۔ اس کے برعکس' وحدت و ایتلاف کی زندگی سے سرخروئی نصیب ہوتی ہے اور خدا کی رحمت ۔۔۔ یَّوْمَ تَبْیَضُّ وُجُوْهٌ وَّتَسْوَدُّ وُجُوْهٌ ۚ فَاَمَّا الَّذِیْنَ اسْوَدَّتْ وُجُوْهُهُمْ ۫ اَكَفَرْتُمْ بَعْدَ اِیْمَانِكُمْ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ﴿۱۰۶﴾ وَاَمَّا الَّذِیْنَ ابْیَضَّتْ وُجُوْهُهُمْ فَفِیْ رَحْمَةِ اللّٰهِ ط هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۱۰۷﴾ ... (3:106-107)-

ان آیات سے ظاہر ہے کہ فرقہ بندی اور باہمی اختلاف کی زندگی لعنت اور عذاب کی زندگی ہے اور خدا کی رحمت ان پر ہوتی ہے جو ایک امت بن کر رہتے اور اختلافات سے بچتے ہیں۔

ضمناً یہ بھی دیکھئے کہ قرآن نے اختلاف اور افتراق کا نتیجہ عذاب عظیم بتایا ہے۔ عظیم کا لفظ جس باب سے آیا ہے اس میں دوام اور استمرار کا پہلو مضمر ہوتا ہے یعنی یہ عذاب وقتی اور ہنگامی نہیں ہوگا بلکہ استمراری اور دوامی ہوگا۔ جب تک فرقہ بندی رہے گی یہ عذاب بھی مسلط رہے گا۔

فرقہ بندی شرک ہے

(9) قرآن نے اس سے بھی آگے بڑھ کر' مسلمانوں سے کہہ دیا کہ : وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ۝۳۱... (30:31)- ''دیکھنا! کہیں تم توحید پرست ہوجانے کے بعد پھر مشرک نہ بن جانا۔!!''

یہ چیز بڑی تحیر انگیز اور (بظاہر) ناقابل فہم تھی کہ مسلمان' ایک خدا پر ایمان لانے کے بعد پھر مشرک کس طرح بن سکتے ہیں؟ کیا یہ بتوں کو پوجنا شروع کر دیں گے؟ قرآن کہتا ہے کہ نہیں۔ شرک بتوں کی پرستش ہی نہیں۔ جیسا کہ ہم بنی اسرائیل کی گئوسالہ پرستی کے قصے میں دیکھ آئے ہیں' بت پرستی تو ''شرک خفی'' (کم درجے کا شرک) ہے۔ ''شرک جلی'' اور ہے۔ اس کی وضاحت میں بتا دیا کہ مشرک ہوجانے سے مطلب یہ ہے کہ : وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ۝۳۱ مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا ط ... (30:32)- ''یعنی ان لوگوں میں سے نہ ہوجانا جنہوں نے اپنے دین میں تفرقہ ڈال دیا اور فرقے بن گئے۔'' اس فرقہ بندی سے ہوتا یہ ہے کہ : كُلُّ حِزْبٍۢ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ۝۳۲ (30:32)- ہر فرقہ اس خیال میں مگن رہتا کہ میں حق پر ہوں اور باقی فرقے باطل پر ہیں۔ فرقہ پرستی کی یہ ایسی نفسیات ہے جس کا مشاہدہ ہم ہر وقت کر سکتے ہیں۔ اس آیت میں كُلُّ حِزْبٍۢ کے ٹکڑے کو خاص طور پر ذہن میں رکھئے کیوں کہ یہ ایک اہم حقیقت کا پردہ کشا ہے جس کا ذکر آگے چل کر آئے گا۔

فرقہ سازوں سے رسول ﷺ کا کوئی تعلق نہیں

بہرحال قرآن نے امت واحدہ سے کھلے کھلے الفاظ میں کہہ دیا کہ اگر تم نے دین میں فرقے پیدا کر لئے تو یہ توحید نہیں' شرک ہوگا اور کوئی فرقہ یہ کہہ کر اس سے بری الذمہ نہیں ہو سکے گا کہ ہم اصلی اور حقیقی اسلام پر قائم ہیں اور دوسرے فرقے باطل پر ہیں۔ اسی بناء پر رسول اللہ ﷺ سے کہہ دیا گیا کہ: اِنَّ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِيْ شَيْءٍ ط ... (6:159)- ''جو لوگ اپنے دین میں تفرقہ پیدا کر دیں' اور ایک فرقہ بن کر بیٹھ جائیں' اے رسول! تجھے ان سے کوئی تعلق نہیں۔'' یعنی فرقے بنانے والوں سے نہ خدا کا کوئی تعلق ہے (کیوں کہ وہ توحید پرست نہیں رہتے' مشرک ہوجاتے ہیں) اور نہ ہی خدا کے رسول کا ان سے کوئی واسطہ۔ کیوں کہ رسول نے تو ایک دین قائم کیا اور ایک امت بنائی تھی۔ یہ الگ امت بنا لینے

والے درحقیقت ایک متوازی دین (نظام زندگی) کے حامل ہو گئے اس لئے انہیں اس رسول سے کیا تعلق؟

اس مقام پر ایک اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک امت بنائی جو دین حق پر قائم تھی۔ اس امت میں سے ایک فرقہ نکل کر الگ ہو گیا۔ اب ظاہر ہے کہ یہ نیا فرقہ شرک کے جرم کا مرتکب اور باطل پرست ہے۔ بقیہ امت کو جو اپنے مسلک پر قائم ہے اسے ایک فرقہ ٹھہرا کر اسی جرم کا مرتکب قرار دے دینا تو کسی صورت میں درست نہیں ہو سکتا؟ یہ اعتراض اہم ہے لیکن اس کا جواب یا اس مشکل کا حل، ذرا آگے چل کر سامنے آئے گا۔

صلوٰۃ وجہ جامعیت

(10) سورہ روم کی جس آیت میں کہا گیا ہے کہ: وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝۳۱ . . . اس سے پہلے ہے وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ''صلوٰۃ کو قائم رکھو اور مشرکین میں سے نہ ہو جاؤ۔'' یعنی ان میں سے جنہوں نے دین میں فرقے پیدا کر دیئے۔ اس سے ظاہر ہے کہ دین میں نظام صلوٰۃ وہ بنیادی حقیقت ہے کہ جب تک یہ قائم رہے، فرقے نہیں بن سکتے۔ یہی وجہ ہے جو قرآن نے کہا ہے کہ جب انبیاءؑ کے جانے کے بعد ان کی امت فرقوں میں بٹ جاتی ہے تو وہ حقیقت صلوٰۃ کو ضائع کر دیتی ہے اور اپنے اپنے جذبات کے پیچھے لگ جاتی ہے۔ فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ . . . (19:59)۔ اس کی زندہ شہادت خود ہماری اپنی حالت ہے۔ ہماری کیفیت یہ ہے کہ وہی صلوٰۃ جسے قرآن نے وحدت امت کا محکم ذریعہ بتایا تھا، آج مختلف فرقوں کی تمیز و تفریق کی علامت بن گئی ہے۔ چنانچہ اگر آپ نے دیکھنا ہو کہ فلاں شخص کس فرقے سے متعلق ہے تو یہ دیکھو کہ وہ نماز کس طرح پڑھتا ہے؟ (یہی وجہ ہے کہ جب طلوع اسلام کے خلاف اس کے مخالفین نے یہ پروپیگنڈہ شروع کیا کہ یہ ایک نیا فرقہ ہے انہیں اپنے اس دعویٰ کی تائید میں یہ الزام بھی تراشنا پڑا کہ یہ لوگ تین وقت کی نماز پڑھتے ہیں اور ایک رکعت میں ایک ہی سجدہ ضروری سمجھتے ہیں۔ گویا انہوں نے ثابت یہ کرنا چاہا کہ چونکہ ان کی نماز اور فرقوں سے مختلف ہے اس لئے یہ ایک نیا فرقہ ہے۔ حالانکہ یہ سب بہتان تراشی اور افترا پردازی تھی۔ نہ طلوع اسلام کوئی الگ نماز تجویز کرتا ہے نہ الگ فرقہ بناتا ہے۔ (جس کے نزدیک فرقہ سازی شرک ہو وہ بھلا خود فرقہ کیسے بن جائے گا؟)

مسجد ضرار

بہرحال، یہ جملہ معترضہ تھا ہم کہہ رہے تھے کہ قرآن نے صلوٰۃ کو امت واحدہ کے لئے وجہ جامعیت قرار دیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ خود رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں بعض تفرقہ انگیزوں نے ایک نئی مسجد تعمیر کی تو قرآن نے جس شدت سے اس کی مخالفت کی اس کا اندازہ سورہ توبہ کی متعلقہ آیات سے لگ سکتا ہے۔ سنئے! اور غور سے سنئے کہ قرآن اس باب میں کیا کہتا ہے: وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا . . . (9:107)۔ ''جن لوگوں نے اس غرض سے مسجد تعمیر کرائی کہ اس سے ملت اسلامیہ اور خود دین کو نقصان پہنچایا جائے۔'' وَكُفْرًا ''اور کفر کی حمایت کی جائے یا کفر کی روش اختیار کی جائے۔'' وَّكُفْرًا وَّتَفْرِيْقًۢا بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ . . . ''یعنی اس غرض سے کہ مسلمانوں میں تفرقہ پیدا کیا جائے۔ تم اس مسجد کو مسجد سمجھتے ہو؟ یہ مسجد نہیں۔

وَاِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ مِنْ قَبْلُ ط . . . ''یہ وہ کمین گاہ ہے جس میں بیٹھ کر وہ شخص جو اس سے پہلے خدا اور رسول (نظام خداوندی) کا دشمن تھا ملت پر تیر اندازی کرے گا۔'' یعنی یہ مسجد نہیں' یہ وہ قلعہ ہے جس کے اندر خدا اور رسول کے دشمن پناہ لے کر دین کے قصر مشید کو منہدم کرنے کی مذموم کوشش کریں گے۔ وَلَيَحْلِفُنَّ اِنْ اَرَدْنَآ اِلَّا الْحُسْنٰى ط . . . ''یہ قسمیں کھا کھا کر کہیں گے کہ اس مسجد کی تعمیر سے ہمارا ارادہ بجز بھلائی کے اور کچھ نہیں۔ ہم دین کی تخریب تھوڑا چاہتے ہیں۔'' وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ۝۱۰۷ . . . ''تم ان کی باتوں میں نہ آ جانا۔ خدا گواہ ہے کہ یہ یکسر جھوٹے ہیں۔'' لَا تَقُمْ فِيْهِ اَبَدًا . . . ''اے رسول! تم اس مسجد میں ایک قدم بھی نہ رکھنا۔ یہ مسجد یونہی سمجھئے کہ دوزخ کے کنارے پر کھڑی ہے۔ جس نے اسے بنایا ہے اور جو اس میں داخل ہو گیا۔ یہ ان سب کو لے کر جہنم کے عمیق گڑھے میں جا گرے گی۔ (9:107-109)- چنانچہ تاریخ اس کی شہادت دیتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے صحابہؓ کو بھیج کر اس مسجد کو منہدم کرا دیا۔

اس واقعہ سے آپ اندازہ لگائیے کہ اسلام میں فرقہ بندی کس قدر شدید اور سنگین جرم ہے کہ (اور تو اور) اگر کسی مسجد کی تعمیر سے بھی فرقہ بندی کی جھلک پڑتی ہو' تو اس مسجد کا گرا دینا ضروری ہو جاتا ہے۔ مسجد گرائی جا سکتی ہے لیکن فرقہ کی طرح نہیں پڑنے دی جا سکتی۔ کیوں کہ فرقہ بندی بہ نص صریح شرک ہے اور شرک جلی۔

☆☆☆

امت واحدہ کی تشکیل

(11) یہ تھیں وہ کھلی کھلی ہدایات جو وحدت امت کے سلسلہ میں مسلمانوں کو دی گئیں۔ انہی ہدایات کی بنا پر نبی اکرم ﷺ نے امت واحدہ کی تشکیل فرمائی۔ یہ وہ امت تھی جس کا نظام ایک تھا۔ ضابطہ زندگی ایک تھا۔ مرکز ایک تھا۔ دین ایک تھا۔ راستہ ایک تھا۔ نصب العین ایک تھا۔ ان میں نہ کسی قسم کا اختلاف تھا نہ افتراق۔ یہی تھی وہ جماعت جس کے متعلق خدا نے کہا ہے کہ: فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا ۚ . . . (3:103)- ''اللہ نے تمہارے دلوں کو ایک دوسرے میں مدغم کر دیا اور دین کے ذریعہ تمہیں ایک دوسرے کا بھائی بنا دیا۔'' رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ۔

اس کے بعد امت پر کیا گذری؟ یہ ایک حدیث ہے دلخراش اور داستان ہے جگر سوز۔ اس لئے تفصیل میں گئے بغیر' قرآن کے الفاظ میں صرف اتنا سن لیجئے کہ: وَمَا تَفَرَّقُوْٓا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ط . . . (42:14)- جس طرح امم سابقہ نے' وحی کے مل جانے کے بعد' باہمی ضد اور سرکشی کے جذبے سے دین میں فرقے بنا ڈالے تھے' یہ بھی فرقوں میں بٹ گئے۔ قرآن کے اس قدر واضح' بین اور صریح احکام و ہدایات' تنبیہات و تاکیدات کی موجودگی میں' امت کا فرقوں میں بٹ جانا یقیناً ایک تحیر انگیز واقعہ ہے۔ لیکن اس حقیقت سے کسے انکار ہو سکتا ہے کہ امت فرقوں میں بٹی اور یہ فرقے اب تک موجود ہیں۔ اس مقام پر رہ کر یہ سوال سامنے آتا ہے کہ فرقوں میں بٹنے والے اپنی اس روش کے جواز میں بال آخر کوئی تو دلیل پیش کرتے ہی ہوں گے؟ جی ہاں! وہ دلیل پیش کرتے ہیں۔

اختلاف امتی رحمۃ

غور سے سنئے وہ دلیل کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ..... رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ اختلاف امتی رحمتہ (میری امت میں اختلاف رحمت ہے)۔ آپ نے سوچا کہ یہ بات کیا ہوئی؟ یعنی وہ اختلاف جس کے متعلق قرآن نے واضح الفاظ میں کہا تھا کہ وہ خدا کا عذاب ہے۔ باعث کفر ہے۔ شرک ہے۔ اسی اختلاف کے متعلق کہا جاتا ہے کہ (معاذ اللہ) رسول اللہ ﷺ نے اسے باعث رحمت قرار دیا! جو شخص ذرا بھی قرآنی تعلیم سے مس رکھتا ہو وہ بلا ادنیٰ تامل کہہ دے گا کہ عربی زبان کا یہ فقرہ کبھی رسول اللہ ﷺ کا نہیں ہوسکتا۔ حضور ﷺ نے کبھی ایسا نہیں فرمایا ہوگا۔ یہ ناممکن ہے کہ خدا ایک چیز کو عذاب قرار دے اور اس کا رسول اسے رحمت بتائے۔ لیکن آپ یہ کچھ کہتے رہئے اور فرقہ پرست اپنی بات پر اڑے رہیں گے کہ نہیں۔۔۔ رسول اللہ ﷺ نے ایسا فرمایا اور ضرور فرمایا تھا۔ یہ محض اس لئے کہ اگر اس فقرے کو حدیث رسول اللہ ﷺ قرار نہ دیا جائے تو پھر فرقہ بندی کے لئے جواز کی راہ کوئی نہیں رہ جاتی۔ لیکن وہ جو قرآن نے کہا ہے کہ جو لوگ حقیقت کو طوعاً (بہ طیب خاطر) نہیں مانتے، حقیقت ان سے اپنے آپ کو کرہاً (مجبوراً) منوالیتی ہے۔ اس کی ایک مثال ہمارے سامنے ہے۔ عرصہ کی بات ہے کہ مرزائیوں کے خلاف یہ اعتراض کیا گیا کہ انہوں نے ایک نیا فرقہ بنا کر امت میں اختلاف پیدا کر دیا ہے۔ اس کے جواب میں انہوں نے کہا کہ اگر ہمارے کسی عمل سے امت میں اختلاف پیدا ہو گیا ہے تو امت کو اس کے لئے ہمارا شکر گذار ہونا چاہئے نہ کہ شکوہ سنج۔ اس لئے کہ حضور ﷺ نے فرمایا ہے کہ اختلاف امتی رحمتہ۔ ہمارا یہ نیا فرقہ امت کے لئے مزید رحمتوں کا باعث ہے۔

یہ حدیث نہیں

آپ سوچئے کہ ان کے اس جواب کا جواب الجواب کیا ہوسکتا ہے۔؟ اس کے جواب میں (جمعیت اہل حدیث کے ترجمان ''الاعتصام'' کو) مجبوراً کہنا پڑا کہ اختلاف امتی رحمتہ کوئی حدیث ہی نہیں۔ اس لئے اسے سند میں پیش نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن اب اس فقرے کو حدیث نہ قرار دینے سے کیا حاصل؟ اس نے جس قدر تباہی مچانی تھی اس ایک ہزار برس میں مچا دی۔ اس نے امت کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے، انہیں فرقوں اور گروہوں میں تقسیم کر کے مستقل جنگ و جدل کا سامان پیدا کر دیا۔ اس نے ان کی سلطنتیں تباہ کر دیں۔ ان کی شوکت و عظمت کو تباہ کر دیا۔ ان کی دنیا اور عاقبت دونوں خراب کر دیں۔ ایسی عظیم ہلاکتوں اور تباہیوں کے بعد اگر اس حقیقت کا اعتراف کیا گیا کہ یہ فرمان رسول نہیں ہے تو اس سے ان نقصانات کی تلافی کیا ہوگی؟ اس قسم کی ہیں وہ وضعی حدیثیں جن کے متعلق طلوع اسلام کہا کرتا ہے کہ یہ عجمی سازش کا نتیجہ ہیں، اور یہی ہے اس کا وہ جرم جس کی پاداش میں اسے گردن زدنی اور کشتنی قرار دیا جاتا ہے۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اس حدیث کو وضعی قرار دیئے جانے کے باوجود، اسے فرقہ بندی کے جواز میں برابر پیش کیا جاتا ہے۔

(73) تہتر فرقے

بہرحال، یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ میں کہہ یہ رہا تھا کہ فرقہ بندی کے جواز میں 'اختلاف امتی رحمتہ' کو بطور دلیل پیش کیا گیا۔ لیکن اس میں ایک سقم ہے وہ یہ کہ اس کی رو سے تمام فرقے موجب رحمت، فلہٰذا حق پر قرار پا جاتے ہیں۔ اور فرقہ بندی اسے کبھی گوارا نہیں کر سکتی کہ ہر فرقہ کو سچا سمجھا جائے۔ لہٰذا اس کے لئے ایک اور حدیث وضع کی گئی جس میں کہا گیا کہ حضور ﷺ نے فرمایا تھا کہ میری امت میں تہتر فرقے ہوں گے۔ ان میں سے ایک فرقہ ناجی ہوگا۔ باقی سب جہنمی ہوں گے۔ آپ نے غور فرمایا کہ اس میں ایک فرقہ کی استثناء نے کس طرح ہر فرقے کو مطمئن کر دیا کہ وہ حق پر ہے اور باقی سب باطل پر ہیں۔ قرآن کریم نے فرقوں کے متعلق کہا تھا کہ: كُلُّ حِزْبٍۭ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ ﴿۳۲﴾ . . . (30:32)- ہر فرقہ اس زعم باطل میں مبتلا رہتا ہے کہ وہ حق پر ہے۔ یعنی قرآن نے "كُلُّ حِزْبٍ" (تمام فرقے) کہہ کر اس چور دروازے کو بند کر دیا تھا جس کے راستے فرقہ پرستی کا جھوٹا اطمینان داخل ہو سکتا تھا۔ لیکن اس وضعی روایت نے "ایک فرقہ" کی استثناء سے اس چور دروازے کو چوپٹ کھول دیا۔ چنانچہ ہماری ہزار سالہ تاریخ اس پر شاہد ہے کہ اسی استثناء کی آڑ میں ہر فرقہ اپنے آپ کو ناجی اور دوسرے فرقوں کو جہنمی قرار دینے کے "جہاد عظیم" میں مصروف چلا آ رہا ہے اور ان کے خون کے چھینٹوں کو اپنے لئے وجہ سرخروئی سمجھ رہا ہے۔

ایک دوسرے کے خلاف کفر کے فتوؤں کا مشغلہ روز اول سے جاری چلا آ رہا ہے۔ فرقہ وارانہ فسادات کی جڑیں آئے دن وجہ سوہان روح ہوتی ہیں۔ ان فسادات کی بیشتر بنیاد مساجد کی "تقسیم" ہوتی ہے۔ باہمی جھگڑے طول کھینچتے ہیں تو پولیس مسجد پر تالہ لگا دیتی ہے۔ مقدمہ عدالت تک پہنچتا ہے اور اس تمام دنگا فساد میں ہر فرقہ اپنے آپ کو ناجی اور فریق مقابل کو جہنم کا کندہ قرار دیتا ہے اور ستم ظریفی یہ کہ دونوں اپنے آپ کو اس اسلام کے پیرو قرار دیتے ہیں جس نے فرقہ بندی کو شرک قرار دیا تھا۔

☆☆☆

پس چہ باید کرد؟

(12) سوال یہ ہے کہ ان حالات میں کیا کیا جائے؟ فرقے بہرحال موجود ہیں اور ان میں کوئی بھی اپنے آپ کو مٹانے کے لئے تیار نہیں، ہر فرقہ، فرقے مٹانے کی تدبیر یہ بتاتا ہے کہ دوسرے فرقے اپنے آپ کو اس فرقے میں شامل کر لیں اور یہ ظاہر ہے کہ اس کے لئے کوئی فرقہ بھی تیار نہیں۔ لہٰذا سوال یہ ہے کہ اس مشکل کا حل کیا ہے؟ یہ سوال بڑا اہم اور بڑا نازک ہے۔ اس لئے اس پر گہرے غور و فکر کی ضرورت ہے۔

(i) قرآن کا دعویٰ ہے کہ وہ ہر قسم کے اختلاف مٹانے آیا ہے۔

(ii) اس پر ہمارا ایمان ہے۔

(iii) قرآن ہمارے پاس اپنی اصلی شکل میں موجود ہے۔

اب آپ سوچئے کہ اگر ہم اس کے بعد بھی یہ کہتے ہیں کہ ہمارے اختلافات مٹ نہیں سکتے اور فرقے ختم نہیں ہو سکتے تو

اس کی زد کہاں جا کر پڑتی ہے؟ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ (معاذ اللہ) قرآن میں اب اس کی صلاحیت نہیں کہ وہ اختلافات مٹا سکے۔ میں یہ پوچھتا ہوں کہ کیا آپ میں سے کوئی بھی ایسا کہنے کی جرات کرسکتا ہے؟ لیکن اگر ہم یہ کہتے ہیں کہ اب ہمارے فرقے مٹ نہیں سکتے تو اس کے معنی اس کے سوا اور کیا ہو سکتے ہیں کہ ہم عملاً اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ قرآن کا یہ دعویٰ صحیح نہیں کہ وہ فرقوں کو مٹا سکتا ہے! اگر قرآن کی صداقت پر ہمارا ایمان ہے تو ہمیں سب سے پہلے اس خیال کو دماغ سے نکال دینا ہوگا کہ قرآن کے ہوتے ہوئے بھی فرقے نہیں مٹ سکتے۔ یاد رکھئے! قرآن کا ہر دعویٰ سچا ہے اور اس میں یہ صلاحیت موجود ہے کہ وہ اختلافات کو مٹا دے۔ اس کے بعد سوال صرف یہ رہ جاتا ہے کہ وہ طریق کیا ہے جس کے مطابق قرآن اختلافات کو مٹاتا ہے۔

فرقہ اہل قرآن

آج سے کچھ عرصہ پہلے ہمارے ہاں (پنجاب میں) ایک جماعت پیدا ہوئی جس کا دعویٰ یہ تھا کہ وہ خالص قرآن پر عمل کرے گی اور اس طرح مسلمانوں میں پیدا شدہ اختلافات کو مٹا دے گی۔ یہ مقصد بڑا نیک اور یہ دعویٰ بڑا مبارک تھا۔ لیکن اس کا جو عملی نتیجہ ہمارے سامنے آیا وہ اس سے بالکل مختلف تھا۔ اس سے سابقہ فرقوں کا مٹنا تو کجا' ان میں ایک اور فرقے ''اہل قرآن'' کا اضافہ ہو گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اختلافات مٹانے کے لئے قرآن نے جو طریق بتایا تھا وہ ان کی نگاہوں سے اوجھل رہا۔ اس لئے ان کی یہ کوشش ناکام رہی۔ بدقسمتی یہ کہ ان کی ناکامی نے خود قرآن کے مشن کو بڑا نقصان پہنچایا۔ اس طرح کہ اب اگر کسی سے کہا جاتا ہے کہ ہمارے اختلافات قرآن کی رو سے مٹ سکتے ہیں تو اس کے جواب میں طنزاً یا ٹھنڈی سانس بھر کر کہہ دیتا ہے کہ صاحب! یہ نسخہ بھی آزمایا جا چکا اور ناکام ثابت ہو چکا ہے۔ یعنی ان حضرات کی ناکامی نے خود قرآن کے متعلق یہ خیال پیدا کر دیا کہ (معاذ اللہ) اس میں اس کی صلاحیت ہی نہیں رہی کہ یہ اختلافات کو مٹا سکے۔

اختلافات مٹانے کا طریق

(13) اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قرآن ان اختلافات کو مٹانے کا کیا طریق بتاتا ہے؟ سب سے پہلے تو یہ سمجھ لیجئے کہ قرآن یہ کہتا ہے کہ: وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهُ إِلَى اللَّهِ ط (42:10)- ''جس معاملہ میں بھی تمہیں اختلاف ہو اس کا فیصلہ (حکم) اللہ کی طرف سے ہونا چاہئے۔'' اس میں ''حکم'' کا لفظ غور طلب ہے۔ یعنی یہ انفرادی چیز نہیں کہ دو آدمیوں میں کسی بھی مسئلہ میں اختلاف ہو اور وہ اپنے طور پر قرآن سے فیصلہ لینے بیٹھ جائیں۔ متنازعہ فیہ امور میں حکم یا فیصلہ' ہمیشہ تیسرے مقام سے ملا کرتا ہے اسے حکم یا ثالث کہتے ہیں۔ اسی مقصد کے لئے قرآن نے رسول اللہ ﷺ سے کہا تھا کہ: فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا ﴿٦٥﴾ (4:65)- ''تیرا رب اس حقیقت پر شاہد ہے کہ یہ کبھی صاحب ایمان نہیں کہلا سکتے' جب تک یہ اپنے اختلافی امور میں تجھے اپنا حکم (فیصلہ دینے والا) تسلیم نہ کریں اور جو فیصلہ یہاں سے صادر ہو' اس کے خلاف اپنے دل میں گرانی محسوس نہ کریں بلکہ اس کے سامنے سر تسلیم خم کر دیں۔''

یعنی قرآن سے فیصلہ انفرادی طور پر نہیں کیا جائے گا بلکہ اس کے لئے ایک زندہ اور محسوس ثالث اور حاکم کی ضرورت ہو گی۔ اس فیصلہ کرنے والی اتھارٹی کو قرآن میں ''اللہ اور رسول'' کی جامع اصطلاح سے تعبیر کیا گیا ہے۔ چنانچہ اس آیت سے چند آیات پہلے ہے: یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ ... (4:59)- ''اے جماعت مومنین! تم اللہ اور..... رسول کی اطاعت کرو۔ اور تم میں سے جنہیں (اللہ اور رسول کی طرف سے) صاحب اختیار بنایا جائے ان کی اطاعت کرو۔''

زندہ مرکز

فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ ... (4:59)- ''اگر تم میں کسی معاملہ میں اختلاف پیدا ہو جائے تو (اسے اپنے طور پر حل کرنے کی کوشش نہ کرو بلکہ) اسے ''اللہ اور رسول'' کی طرف لوٹا دو۔ اگر تم ایسا نہ کرو گے تو سمجھا جائے گا کہ تمہارا اللہ اور آخرت پر ایمان نہیں ہے۔'' اس کے معنی صاف یہ ہیں کہ دو افراد میں اختلاف تو ایک طرف' اگر افسران ماتحت کے کسی فیصلہ سے بھی اختلاف ہو تو اسے قرآنی نظام کی مرکزی اتھارٹی (اللہ اور رسول) کی طرف لوٹا دو۔ یہی شرط ایمان ہے۔ اگر ایسا نہ کیا جائے گا تو یہ کفر ہو جائے گا۔

ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ قرآن نے تفرقہ اور اختلاف کو کفر سے تعبیر کیا ہے۔ اس کفر سے محفوظ رہنے کی عملی شکل یہ بتائی گئی ہے کہ امت کے پاس قرآن اور اور قرآن کی روشنی میں فیصلہ دینے والا رسول۔ چنانچہ سورہ آل عمران میں ہے: وَكَیْفَ تَكْفُرُوْنَ وَاَنْتُمْ تُتْلٰى عَلَیْكُمْ اٰیٰتُ اللّٰهِ وَفِیْكُمْ رَسُوْلُهٗ ؕ ... (3:101)- ''تم کس طرح کفر میں مبتلا ہو سکتے ہو؟ جب کہ حالت یہ ہے کہ

(i) تمہارے پاس کتاب اللہ موجود ہے اور (ii) اس کے ساتھ تم میں اس کا رسول ﷺ موجود ہے۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ جب تک امت میں (i) قرآن' اور (ii) رسول موجود ہو' فرقے پیدا نہیں ہو سکتے۔

اس سے ہمارے سامنے ایک اور سوال آ گیا۔ اور وہ یہ کہ قرآن کی ان آیات سے تو یہ معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کی موجودگی (یعنی زندگی) تک امت نے فرقوں سے بچے رہنا تھا لیکن آپ کے بعد فرقوں سے محفوظ رہنے کی کوئی صورت نہیں تھی کیونکہ فرقوں سے بچنے کے لئے قرآن اور رسول دونوں کی موجودگی کی ضرورت تھی اور جب ان میں سے ایک جزو (رسول) موجود نہ رہا تو فرقہ بندی سے محفوظ رہنے کا امکان بھی باقی نہ رہا۔

فِیْكُمْ رَسُوْلُهٗ کے معنی

قرآن کہتا ہے کہ تم نے بات کو صحیح طور پر نہیں سمجھا۔ تم اس خیال میں ہو کہ ''رسول ﷺ کی موجودگی'' سے مراد یہ ہے کہ جب تک محمد رسول اللہ ﷺ تم میں زندہ موجود ہیں اس وقت تک یہ شکل باقی رہے گی۔ جب وہ وفات پا جائیں گے تو پھر ''رسول'' موجود نہیں رہے گا۔ یہ بات غلط ہے۔ یہ سلسلہ رسول کی طبعی زندگی سے مشروط نہیں۔ اس کے بعد بھی قائم رہے گا۔ چنانچہ سورہ آل عمران میں یہ کہہ کر اس کی صراحت کر دی گئی کہ: وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ

اَفَاۡئِنۡ مَّاتَ اَوۡ قُتِلَ انۡقَلَبۡتُمۡ عَلٰۤی اَعۡقَابِکُمۡ ؕ . . . (3:144)- ''محمد ﷺ بجز ایں نیست کہ اللہ کا رسول ہے۔ اس سے پہلے بہت سے رسول (اپنا فریضہ پیغام رسانی ادا کرنے کے بعد) دنیا سے چلے گئے۔ سو اگر (کل کو) یہ وفات پا جائے یا قتل کر دیا جائے تو کیا تم یہ سمجھ کر کہ یہ نظام اس کی زندگی تک محدود تھا) پھر اپنی سابقہ روش کی طرف لوٹ جاؤ گے''؟ وَمَنۡ یَّنۡقَلِبۡ عَلٰی عَقِبَیۡہِ فَلَنۡ یَّضُرَّ اللّٰہَ شَیۡئًا ؕ . . . (3:144)- ''جو (رسول کی وفات پر) اپنی سابقہ روش پر لوٹ جائے گا تو وہ اللہ کو نقصان نہیں پہنچائے گا۔'' (اپنا ہی کچھ بگاڑے گا)۔

اس سے بات بالکل واضح ہوگئی۔ یعنی یہ کہ: و فیکم رسول اللہ . . . سے مراد رسول اللہ ﷺ کی طبعی زندگی نہیں۔ آپ ﷺ کی وفات کے بعد بھی یہ سلسلہ بدستور باقی رہ سکتا تھا۔

رسول اللہ ﷺ کے بعد

جب رسول اللہ ﷺ وفات پا گئے تو امت میں کہرام مچ گیا۔ ایسا ہونا فطری امر تھا۔ شدت جذبات میں بعض لوگوں کے دل میں یہ خیال پیدا ہو گیا کہ جس نظام کو رسول اللہ ﷺ نے قائم فرمایا تھا' اب وہ ختم ہو گیا۔ اس کے لئے وَفِیۡکُمۡ رَسُوۡلُہٗ ؕ . . . کی شرط تھی۔ اس غلط فہمی کو رفع کرنے کے لئے حضرت ابوبکر صدیق ؓ برسر منبر تشریف لائے اور وَفِیۡکُمۡ رَسُوۡلُہٗ ؕ . . . کا قرآنی مفہوم اس انداز سے سمجھا دیا کہ اس سے بہتر انداز کوئی ہو نہیں سکتا تھا۔ آپ نے فرمایا کہ: یایھا الناس من کان منکم یعبد محمد افانہ قد مات و من کان یعبد اللہ فانہ حی لا یموت ''اے لوگو! جو تم میں سے محمد ﷺ کی محکومیت اختیار کئے تھا۔ اسے معلوم ہونا چاہئے کہ اس کا معبود وفات پا گیا ہے لیکن جو خدا کی محکومیت اختیار کئے تھا اس کا معبود زندہ ہے اور ہمیشہ زندہ رہے گا۔'' اس کے بعد آپ نے وہی آیت پڑھی جو اوپر بیان ہو چکی ہے۔ یعنی وما محمد الا رسول . . . اس سے حقیقت بے نقاب ہو کر سامنے آ گئی۔ حاضرین سمجھ گئے کہ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد یہ نظام کس طرح قائم رہے گا۔ چنانچہ وہ اٹھے اور انہوں نے فوراً خلیفتہ الرسول (یعنی رسول اللہ کے جانشین) کا انتخاب کیا اور اس طرح رسول اللہ ﷺ کی وفات سے جو خلا پیدا ہو گیا تھا اسے پر کر لیا۔ اس لئے کہ یہ ظاہر ہے کہ کسی کے جانشین کی موجودگی خود اس کی اپنی موجودگی ہوتی ہے۔ اس طرح امت میں ''قرآن اور رسول'' بدستور موجود رہے۔

خلیفتہ الرسول کی حیثیت

اس مقام پر اتنا اور واضح کر دینا ضروری ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد اسلامی نظام قائم کرنے کے فریضہ کی ادائیگی پوری امت کے ذمے عائد ہوتی تھی۔ اس لئے کہ قرآن نے واضح الفاظ میں بتا دیا تھا کہ (i) کتاب اللہ کی وارث امت ہے نہ کہ کوئی ایک فرد۔ سورہ فاطر میں ہے۔ وَالَّذِیۡۤ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلَیۡکَ مِنَ الۡکِتٰبِ ہُوَ الۡحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیۡنَ یَدَیۡہِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ بِعِبَادِہٖ لَخَبِیۡرٌۢ بَصِیۡرٌ ﴿۳۱﴾ (35:31)- ''اللہ وہ ہے جس نے تیری طرف (اے رسول) یہ کتاب نازل کی جو ان حقیقتوں کو سچ کر دکھانے والی ہے جو اس کے سامنے ہیں۔'' ثُمَّ اَوۡرَثۡنَا الۡکِتٰبَ الَّذِیۡنَ اصۡطَفَیۡنَا مِنۡ عِبَادِنَا ۚ . . . (35:32)- ''اس کے بعد اس نے اس کتاب کی وراثت کے لئے اپنے بندوں میں سے (اس امت کو) منتخب کر لیا ہے۔''

یعنی پہلی بات یہ ہے کہ قرآن کی وارث پوری کی پوری امت ہے۔ اس کے بعد آگے بڑھئے۔

(ii) رسول ﷺ اللہ کا فریضہ یہ تھا کہ: يَأْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهٰهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ ... (7:157)- وہ معروف کا حکم دیتا تھا اور منکر سے روکتا تھا۔ اب یہی فریضہ امت کی طرف منتقل ہو گیا۔ چنانچہ سورہ آل عمران میں ہے۔ كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ... (3:110)- ''تم بہترین امت ہو' جسے نوع انسانی کی فلاح و بہبود کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ تمہارا فریضہ یہ ہے کہ تم معروف کا حکم دو اور منکر سے روکو۔''

امت کا نمائندہ

ان حقائق سے واضح ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی جانشین درحقیقت پوری کی پوری امت ہے۔ عملی انتظام کی سہولت کے لئے امت اپنے میں سے بہترین فرد کو اپنا نمائندہ بنا کر اس سلسلہ کو قائم رکھتی ہے۔ اس طرح امت میں ''کتاب اور رسول'' بدستور باقی رہتے ہیں۔ ان کی موجودگی میں اختلافات کے رونما اور فرقوں کے پیدا ہونے کا امکان ہی نہیں رہتا۔ چنانچہ تاریخ اس پر شاہد ہے کہ دور خلافت میں نہ کوئی اختلاف پیدا ہوا' نہ کسی فرقے نے جنم لیا۔ اس لئے کہ اس دور میں کوئی ایک مثال بھی ایسی نہیں ملتی کہ کسی اختلافی معاملہ کے تصفیہ کے لئے افراد امت از خود فیصلہ کرنے بیٹھ گئے ہوں۔ اختلافی امور میں مرکزی اتھارٹی کی طرف رجوع کیا جاتا تھا اور اس کے فیصلوں کی اطاعت سب پر لازم تھی۔ اسی اتھارٹی کو خلافت علیٰ منہاج نبوت کہا جاتا ہے۔

ایک اہم سوال کا جواب

یہیں سے ہمیں اس سوال کا جواب بھی مل جاتا ہے جس کی طرف میں نے شروع میں اشارہ کیا تھا۔ یعنی یہ سوال کہ امت ایک طریق پر قائم ہے۔ کچھ لوگ اس طریق سے اختلاف کر کے الگ فرقہ بنا لیتے ہیں' اس صورت میں امت دو فرقوں میں بٹ گئی۔ جن لوگوں نے الگ فرقہ بنا لیا وہ تو یقیناً مجرم ہیں' لیکن جو پہلے طریق پر قائم رہے انہیں تو مجرم نہیں قرار دیا جا سکتا۔ بالکل ٹھیک ہے۔ یہ ہے وہ دلیل جسے ہر فرقہ کی طرف سے یہ کہہ کر پیش کیا جاتا ہے کہ ہم حقیقی اسلام پر قائم ہیں اور الگ فرقے دوسروں نے بنائے ہیں۔ لیکن ایسا کہنے میں اس حقیقت کو فراموش کر دیا جاتا ہے کہ جب تک ''وَفِيكُمْ رَسُولُهُ ط'' کی کیفیت رہے۔ یہ صورت جسے یوں بیان کیا جاتا ہے' پیدا ہی نہیں ہو سکتی۔ اس وقت اگر کوئی جماعت' امت سے اختلاف کرے گی تو رسول ﷺ کا جانشین قرآن کے اس حکم کے ماتحت کہ: إِنَّ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ ط ... (6:159)- اس امر کا اعلان کر دے گا کہ امت کو اس نئے فرقے سے کوئی سروکار نہیں۔ لہٰذا وہ امت کا فرقہ کہلا ہی نہیں سکے گا۔ اسے مسلمانوں سے کچھ واسطہ ہی نہیں رہے گا۔ وہ اسلام کے دائرہ سے خارج ہو گا۔ اس لئے امت' امت واحدہ ہی رہے گی۔ یعنی خلافت علیٰ منہاج نبوت میں' مسلمانوں میں کوئی فرقہ پیدا ہی نہیں ہو سکے گا۔

بہرحال یہ تھی وحدت امت کی وہ عملی شکل جسے قرآن نے رسول ﷺ اللہ کی وفات کے بعد تجویز کیا تھا اور جسے حضور ﷺ کی وفات کے بعد اختیار کیا گیا۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد یہ صورت قائم نہ رہی' خلافت کی جگہ ملوکیت نے لے لی۔ سلاطین نے اپنی مصلحتوں کے ماتحت سیاست کو مذہب سے الگ کر لیا۔ اس یکسر غیر قرآنی تقسیم کی رو سے' سیاست سے متعلق

امور کے فیصلے بادشاہ خود کرتے تھے۔ باقی رہی شریعت، سو اس کے متعلق اس کے سوا کوئی صورت ہی نہ تھی کہ لوگ انفرادی طور پر فیصلے کرتے۔ اس ضمن میں ایک اور دشواری سامنے آئی۔ قرآن نے ''اللہ اور رسول'' کی اطاعت کا حکم دیا تھا۔ ''اللہ اور رسول'' کا جو مفہوم قرآنی نظام میں لیا جاتا تھا۔ اس مفہوم کی اب گنجائش ہی نہ تھی۔ اس لئے کہ اب وہ نظام ہی باقی نہ تھا۔ لہٰذا اب ''اللہ اور رسول'' کی اطاعت کا کوئی نیا مفہوم لیا جانا ناگزیر ہو گیا۔ اللہ کی اطاعت کے متعلق تو سمجھ لیا گیا کہ اس سے مراد کتاب اللہ کی اطاعت ہے، لیکن رسول ﷺ کی اطاعت کس طرح کی جائے۔ یہ سوال مشکل تھا۔ اس کے حل کے لئے اس کے سوا کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی کہ حضور ﷺ کی احادیث کی طرف رجوع کیا جائے۔ زمانہ خلافت میں چونکہ اطاعت رسول کا عملی مفہوم سامنے تھا۔ اس لئے احادیث کے جمع اور مرتب کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ لیکن اب اس کی ضرورت پڑ گئی لہٰذا احادیث کے مجموعے مرتب کئے گئے۔ اب ''اللہ اور رسول'' کی اطاعت کا طریق یہ قرار پایا کہ قرآن اور حدیث کی رو سے متنازعہ فیہ امور کے فیصلے انفرادی طور پر کئے جائیں۔ ان انفرادی فیصلوں میں اختلاف ناگزیر تھا۔ اس لئے مختلف فرقوں کے نزدیک ''قرآن اور حدیث'' کے فیصلے مختلف ہو گئے۔ ان اختلافات کو مٹانے کے لئے مناظرے اور مباحثے شروع ہو گئے۔ اس کا جو نتیجہ نکلا وہ ہمارے سامنے ہے، یعنی:-

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی.....

چنانچہ آج حالت یہ ہے کہ امت میں بیسیوں فرقے موجود ہیں اور ہر فرقہ خدا اور رسول کی اطاعت کا مدعی اور حقیقی اسلام پر کاربند ہونے کا دعویدار ہے، اور چونکہ اختلافات مٹانے والی کوئی زندہ اتھارٹی موجود نہیں۔ یعنی ''وَفِيكُمْ رَسُولُهُ ط'' کی شکل باقی نہیں۔ اس لئے کوئی فیصلہ نہیں دے سکتا کہ کون غلط کہتا ہے اور کون صحیح۔

میرا خیال ہے کہ اب ہم اس مقام تک پہنچ گئے ہیں جہاں ہمیں اس سوال کا جواب از خود مل جائے کہ امت میں وحدت پیدا کرنے کی شکل کیا ہے؟ اس کی شکل یہ ہے کہ جس نظام کے گم ہو جانے سے فرقہ بندی شروع ہوئی تھی، اس نظام کو پھر قائم کر دیا جائے۔ اس کے لئے پہلا قدم یہ ہے کہ اس فکر کو عام کیا جائے کہ فرقوں کی موجودگی اور اسلامی زندگی دو متضاد چیزیں ہیں جو، قرآن کی رو سے ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتیں اور فرقوں کو مٹا کر اسلامی زندگی پیدا کرنے کا طریق، قرآنی نظام (خلافت علیٰ منہاج نبوت) کے قیام کے سوا کوئی نہیں۔ طلوع اسلام کے سامنے یہی مقصد ہے اور اسی کے حصول کے لئے یہ مصروف جدوجہد ہے۔

لیکن اگر کوئی شخص یہ سمجھتا ہے کہ اب قرآنی نظام کے قیام کا کوئی امکان نہیں، تو اسے کم از کم اپنے آپ کو اس فریب میں مبتلا نہیں رکھنا چاہئے کہ ہماری موجودہ زندگی اسلامی زندگی ہے۔ یا (فرقوں کے باوجود) اسلامی ہو سکتی ہے۔ مجھے اس کا احساس ہے کہ آپ اس حقیقت کو سامنے لانے کے لئے بآسانی تیار نہیں ہوں گے۔ آپ اسے کبھی تسلیم نہیں کرنا چاہیں گے کہ فرقوں کی موجودگی میں اسلامی زندگی بسر نہیں ہو سکتی۔ آپ کے نزدیک قابل قبول یہی مسلک ہو گا کہ تمام فرقوں میں سے ایک فرقہ حق پر ہے، اس سے آپ کو یہ اطمینان حاصل ہو جاتا ہے کہ جس فرقے سے میں متعلق ہوں وہ حق پر ہے، لہٰذا اس کے مطابق زندگی اسلامی ہے۔ جو نظریہ آپ سے اس اطمینان کو چھینتا ہے، وہ آپ کے نزدیک قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ آپ کو اس

کے خلاف غصہ آئے گا لیکن آپ کا یہ غصہ خود قرآن کے خلاف ہونا چاہئے جو فرقہ بندی کو شرک قرار دیتا ہے نہ کہ اس کے خلاف جو قرآن کی اس تعلیم کو آپ کے سامنے پیش کرتا ہے۔ یا تو آپ یہ کہئے کہ یہ قرآن کی تعلیم نہیں اور اگر آپ اس کی تردید نہیں کر سکتے تو پھر آپ کے برافروختہ ہو جانے سے قرآنی حقیقت اپنی جگہ سے بدل نہیں جائے گی۔

یاد رکھئے! جب تک آپ اس تلخ حقیقت کو گوارا نہیں کر لیتے کہ فرقہ بندی کی زندگی قطعاً اسلامی زندگی نہیں، آپ قرآن کے بتائے ہوئے صراطِ مستقیم پر نہیں آ سکتے۔ قرآن کی رو سے صراطِ مستقیم ایک ہی ہے۔ جب امت مختلف راستوں پر چل نکلے تو پھر وہ صراطِ مستقیم کسی کے سامنے بھی نہیں رہتا۔ سورہ انعام میں اس حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ: وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِیْلِهٖ ؕ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۵۳﴾ (6:153)- یاد رکھو! میرا یہی ایک سیدھا راستہ ہے۔ پس تم سب اس کا اتباع کرو۔ اس کے سوا دوسرے راستوں پر نہ چلو۔ وہ راستے تمہیں اس صراطِ مستقیم سے متفرق اور پراگندہ کر دیں گے۔ اللہ نے تمہیں اس کا حکم دیا ہے تاکہ تم تقویٰ شعار رہ سکو۔

بات پھر پھرا کر وہیں آ گئی کہ

(1) فرقے صرف اسلامی نظام میں مٹ سکتے ہیں۔

(2) اسلامی نظام کے معنی ہیں ایک ایسی مملکت کا قیام جو قرآنی اصولوں کے مطابق وجود میں آئے اور جس کا تمام کاروبار قرآنی حدود و قیود کے اندر رہتے ہوئے سرانجام پائے۔

(3) اس مملکت کی طرف سے جو قوانین نافذ ہوں گے، ان کا اطلاق مملکت کے تمام مسلم باشندوں پر یکساں ہوگا۔ اس میں نہ کوئی فرقہ ہوگا نہ کسی فرقہ کی الگ فقہ۔ قرآن سب کا ضابطہ قوانین ہوگا۔

قرائن بتا رہے ہیں کہ اس قسم کی قرآنی مملکت کے قیام کے لئے موجودہ مسلمان کبھی راضی نہیں ہوں گے کیوں کہ، یہ سب فرقوں میں بٹے ہوئے ہیں اور کوئی فرقہ اپنی فقہ کو چھوڑنے پر آمادہ نظر نہیں آتا۔ اس سے آپ لامحالہ اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ ہم (موجودہ مسلمانوں) میں نہ ایسا نظام قائم ہو سکتا ہے، نہ فرقے مٹ سکتے ہیں۔

اس کا عملی مفہوم یہی ہے کہ اسلامی نظام اس قوم میں قائم ہو سکے گا جو مندرجہ بالا اصول کو تسلیم کرتے ہوئے اسلام لائے گی۔۔۔ خواہ وہ موجودہ مسلمانوں میں سے ہوں اور خواہ پہلی بار اسلام لائے۔ قرآن کریم نے مسلمانوں کو بھی جو ایمان لانے کے لئے کہا ہے تو اس سے یہی مراد ہے۔ ارشاد ہے: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِیْ نَزَّلَ عَلٰی رَسُوْلِهٖ . . . (4:136)- اے مسلمانو! تم، ایمان لاؤ اللہ پر، اس کے رسول پر، اور اس کتاب پر جسے خدا نے اپنے رسول پر نازل کیا تھا۔ یہ، از سر نو ایمان لانا در حقیقت، فرقہ وارانہ زندگی کو خلاف اسلام تسلیم کر کے، قرآنی نظام کے قیام کی طرف پیش رفت کے لئے قدم اٹھانا ہے۔ یہ مرحلہ بڑا دشوار گذار نظر آتا ہے لیکن، اس کے سوا احیاء اسلام کی کوئی صورت نہیں۔ اگر ہم اپنی موجودہ غیر اسلامی زندگی کو اسلامی کہہ کر اپنے آپ کو فریب دیتے ہیں، تو اس سے ہماری زندگی، اسلامی نہیں ہو جائے گی! اسلامی زندگی کے لئے ''امت واحدہ'' (جس میں کوئی فرقہ نہ ہو) بنیادی شرط ہے، اور یہ صرف قرآنی مملکت میں ممکن ہے۔

آصف جلیل، لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قرآن کریم سمجھنا نہایت آسان

ادارہ طلوع اسلام لاہور کا شائع کردہ 41 جلدوں پر مشتمل مجموعہ بعنوان مطالب الفرقان فی دروس القرآن اسے بلا مبالغہ قرآن کریم کا انسائکلو پیڈیا کہا جا سکتا ہے۔

علامہ غلام احمد پرویز رحمہ اللہ (1903ء تا 1985ء) کی زندگی کے پچاس سال قرآن کریم پر تحقیق کرنے اور اسے اردو پڑھنے والوں کے لئے عام کرنے میں صرف ہوئے۔ انہوں نے چالیس کے قریب کتابیں لکھیں ان میں کچھ ۲ سے ۷ جلدوں پر مشتمل ہیں۔ ان میں سب سے اہم لغات القرآن ہے جس میں عربی زبان کی مشہور لغات سے قرآن کے الفاظ منتخب کر کے ان کے اردو زبان میں معانی بیان کئے اور قرآنی آیات کا حوالہ بھی دیا۔ قرآن کریم پر تحقیق کرنے والوں کے لئے نہایت مفید ہے۔ اس کے علاوہ موضوع کے لحاظ سے قرآنی آیات کی تلاش کرنے کے لئے ان کی کتاب تبویب القرآن نے بے شمار لوگوں کے لئے آسانی پیدا کی۔ مفہوم القرآن تصریف اٰل آیات کی بنیاد پر قرآن کریم کا مفہوم بیان کیا۔ اس کے علاوہ زندگی کے تمام شعبوں پر محیط موضوعات پر کتب شائع کیں۔

اس کے علاوہ وہ ہفتہ وار درس قرآن بھی دیا کرتے تھے جن کا پہلا دور سے تک جاری رہا اور اس کے بعد 1962 سے ان کی وفات تک جاری رہا۔ یہ دروس اس زمانے میں دستیاب آڈیو ریکارڈر پر محفوظ کیے گئے۔ اس کے ٹیپ پاکستان کے مختلف شہروں کے علاوہ بیرون ملک بھی بھیجے جاتے تھے۔ میں جب ویڈیو ریکارڈنگ کی سہولت دستیاب ہوگئی تو آڈیو کے ساتھ ساتھ ان کی ویڈیو ریکارڈنگ بھی کی جاتی تھی۔ مرور زمانہ کے ساتھ ابتدائی دور کی آڈیوز میں آواز کے معیار میں انحطاط آ رہا تھا۔ میں ادارہ طلوع اسلام کی ایک ٹیم نے ان دروس کو سن کر تحریر میں لانا شروع کیا۔ اس کی پروف ریڈنگ کے بعد ان کو چھاپنے کا سلسلہ شروع کیا جو میں پایہ تکمیل تک پہنچا جو 40 جلدوں پر مشتمل ہے جس میں مکمل قرآن کریم کی تشریح آ گئی ہے۔

علامہ پرویزؒ نے ایک ایک لفظ کی نہایت مفصل انداز میں تشریح کی ہے کہ قاری کو کسی قسم کی تشنگی نہیں رہتی۔ آپ کے سمجھانے کا انداز نہایت دلکش تھا اور وہ آیات کی تشریح کے ساتھ ساتھ بہت سے موضوعات پر بھی بات کرتے تھے جن کا تعلق زیر بحث آیت سے ہوتا تھا۔ اس لحاظ یہ قرآن کریم کی تشریح کے علاوہ معلومات کا ایک ذخیرہ ہے۔ اس میں سے کچھ اہم موضوعات کو یہاں درج کیا جا رہا ہے۔

تاریخ پاکستان:

دروس کے دوران دو قومی نظریے کا ذکر اکثر آتا ہے جو قرآن کریم کے عین مطابق ہے۔ پاکستان بننے سے پہلے علامہ پرویزؒ کی علامہ اقبال سے ملاقاتوں کے بارے میں اور ان کے بتائے ہوئے طریقے سے قرآن کریم کو سمجھنا شروع کیا جو تصریف اٰل آیات اور زمانہ نزول قرآن کے وقت بولی جانے والی عربی زبان کے مطابق تھا۔ لغات القرآن مرتب کرنے کا

مشورہ بھی علامہ اقبال ہی نے دیا تھا۔ انہوں نے ہی قائداعظم محمد علی جناح سے خط و کتابت کی اور انہیں وطن واپس آ کر مسلم لیگ میں شمولیت اور قیام پاکستان کی جدوجہد شروع کرنے پر آمادہ کیا۔ جب دیوبند کے علماء نے قائداعظم کی مخالفت کی تو علامہ پرویز نے اس محاذ کو سنبھالا اور ماہنامہ طلوع اسلام کا اجراء کیا جس میں ان علماء کا مقابلہ کیا۔ ان کی قائداعظم سے ملاقاتیں رہتی تھیں۔ اس بارے میں پیش آنے والے بہت سے واقعات ایسے ہیں جن کا ذکر کہیں اور نہیں ملتا۔ پاکستان بننے کے بعد اور قائداعظم کی وفات کے بعد جب یہ بحث چھڑ گئی کہ کیا وہ پاکستان کو سیکولر اسٹیٹ بنا چاہتے تھے یا اسلامی تو علامہ پرویزؒ نے ہمیشہ قائداعظم کی تقاریر کے حوالے دے کر ثابت کیا تھا کہ وہ فی الواقع اسلامی مملکت ہی قائم کرنا چاہتے تھے جو قرآن کی بنیاد پر ہو نہ کہ مذہبی پیشوائیت کے مطابق ہو۔ علامہ پرویز قیام پاکستان کے بعد بھی ملکی حالات سے بے خبر نہیں رہے۔ ان دروس میں ملک کو درپیس مسائل کا حل قرآن کریم کی روشنی میں ان کا جائزہ لیا کرتے تھے اور اسی کے مطابق مسائل کا حل پیش کیا کرتے جو پاکستان کی تاریخ کی اہم دستاویز بن چکی ہے۔

تاریخ اسلام:

عہد رسالت مآب ﷺ کے بعد جب خلفاء راشدین کا دور اختتام کو پہنچا تو کیسے خلافت ملوکیت میں تبدیل ہوئی اور اس دوران روایات جمع کرنے کا سلسلہ جاری ہوا۔ آہستہ آہستہ امور مملکت میں قرآن کریم کو نظر انداز کر کے مروجہ روایات کو اہمیت ملتی گئی جس سے اسلام بطور مذہب رائج ہوتا گیا جس کا حکومتی معاملات میں کوئی عمل دخل نہیں تھا بلکہ محض رسومات کا مجموعہ بن کر رہ گیا جنہیں ادا کرنے کے لئے حکومتی سطح پر بھی اہتمام ہوتا تھا۔ یہ سب کچھ آج تک جاری ہے اور لوگوں کو یہ بات تسلیم کرنے میں تامل ہوتا ہے کہ قرآن کریم میں مملکت کا تصور بھی ہے جو ہر شعبہ ہائے زندگی کا احاطہ کرتا ہے۔ وہ مروجہ تاریخی واقعات کا جائزہ قرآن کریم کی روشنی میں لیتے تھے اور صرف انہیں واقعات کو صحیح مانتے تھے جو قرآن کریم کے مطابق ہوں اور نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرامؓ سے منسوب بہت سے واقعات اس لئے قبول نہیں کیا کہ ان میں ان کی شخصیتوں پر حرف آتا تھا۔ قرآنی آیات کی تشریح کرتے ہوئے جہاں پر مروجہ تصور جو روایات کی رو سے ہوتا ہے انہوں نے تفصیل سے ذکر کیا اور دلائل سے قرآن کریم کے مطابق اپنا موقف بیان کیا۔ اس بنا پر ہمیشہ مذہبی پیشوائیت کی طرف سے ان کی مخالفت بھی ہوتی رہی۔ یہ سب کچھ ان دروس میں پڑھنے کا موقع ملے گا۔

قرآن کریم کی تشریح عربی لغت کی رو سے:

علامہ پرویز نے قرآن کریم میں موجود تمام اصطلاحات کی تشریح عربی لغت کی روشنی میں کی ہے جن کا مفہوم بدلا جا چکا ہے۔ اس سے لوگوں کو خود قرآن سمجھنے میں آسانی ہو جاتی ہے اور عربی زبان سیکھنے میں مدد ملتی ہے اور بہت زیادہ محنت بچ جاتی ہے۔

قرآن اور سائنس:

علامہ پرویزؒ نے دروس کے دوران کائنات میں غور و فکر کرنے اور طبعی قوانین کے بارے جو آیات آئی ہیں ان کو سائنس دانوں کی تحقیقات کی روشنی میں جائزہ لے کر ثابت کیا کہ قرآن کریم نے اس بارے میں چودہ سو سال پہلے ذکر کیا تھا جس سے اس کے من جانب اللہ ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔ جہاں مذہب کی دنیا میں عقل سے ماورا باتوں کو فخر سے پیش کیا جاتا

ہے وہاں سائنسی علوم کو نفرت کی نگاہ سے دیکھا گیا حالانکہ ان کی بنیاد طبعی قوانین پر ہے جو اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے ہیں جن کا سائنس دانوں نے انکشاف کیا ہے۔

اسلوب بیان:

علامہ پرویزؒ کا اسلوب بیان نہایت شستہ اور جاذب ہوتا تھا جو سامعین کے لئے ایک کشش رکھتا تھا۔ ان کے درس کا ماحول جذباتی لفاظی کی بجائے ایک کلاس روم جیسا ہوتا تھا جیسے ایک استاد نہایت خوش اسلوبی سے سمجھا رہا ہو۔ ان کی مادری زبان پنجابی تھی اور بعض اوقات وہ پنجابی زبان میں سمجھاتے ہوئے کہتے تھے کہ کچھ مقامات پر پنجابی زبان بہتر طور پر مدعا بیان کرتی ہے۔ اردو بولنے والوں سے معذرت کرتے ہوئے وہ اس کا مفہوم بھی بیان کرتے تھا۔ پنجابی بولنے والوں کے لئے بھی بہت سے الفاظ نئے ہوتے تھے جو ان کے علم میں اضافہ کرتے ہیں۔ جیسا کہ ہر زبان کا خاصہ ہوتا ہے وہ اپنی بات سمجھانے کے لئے مثالوں، محاوروں اور ضرب الامثال کا سہارا لیتے تھے۔ اس طرح سننے والوں کے ادبی علم میں اضافہ ہوتا ہے۔

اشعار:

علامہ پرویز درس دیتے ہوئے موضوع سے متعلق اَشعار پیش کرتے تھے جن میں سب سے زیادہ علامہ اقبال کے اردو اور فارسی کے اشعار ہوتے تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ علامہ اقبال قرآن کریم کو بہت اچھی طرح سمجھتے تھے اور ان کے بے شمار اشعار قرآنی آیات کی ترجمانی کرتے تھے۔ فارسی اشعار کا مفہوم بھی بیان کرتے تھے۔ اس کے علاوہ بھی اور دوسرے شاعروں کے اشعار بھی پیش کرتے تھے جو شاعری کا ذوق رکھنے والوں کے لئے دلچسپی کا باعث ہیں۔ یہ جاننے کے لئے کہ علامہ اقبال کے کونسے اشعار قرآنی مفہوم کی تائید کرتے ہیں دروس کا مجموعہ بہت مفید ہے جو کہیں اور جگہ ملنا بہت مشکل ہے۔

صوفی ازم:

علامہ پرویز کا تعلق صوفی گھرانے سے تھا وہ چلے کاٹا کرتے تھے اور مشقیں کیا کرتے تھے۔ اسی دوران انہوں نے دیکھا کہ جنہیں کرامات کہا جاتا ہے وہ تو ہندو سادھو بھی دکھا سکتے ہیں جس کا مطلب تھا کہ ان کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس کے بعد انہوں نے ساری توجہ قرآن کریم پر غور و فکر پر مرکوز کر دی۔ ان دروس میں وہ صوفی ازم کی حقیقت اپنے تجربات کی روشنی میں بیان کرتے ہیں۔

ظرافت اور مزاح:

کبھی کبھار درس کے دوران علامہ پرویز موقع محل کے مطابق اپنی حس مزاح کا مظاہرہ بھی کرتے تھے جس سے بے اختیار لوگوں کی ہنسی نکل جاتی تھی اور محفل زعفران بن جاتی تھی۔ عام طور پر مذہبی گفتگو میں اسے معیوب سمجھ لیا گیا ہے حالانکہ اس طرح سننے والوں کی دلچسپی برقرار رہتی ہے اور بات ذہن نشین بھی ہو جاتی ہے۔ یہ مختصر تعارف آپ کو ان دروس کا مطالعہ کرنے پر مجبور کر دے گا۔

ابھی رابطہ کریں: ادارہ طلوع اسلام 25 بی گلبرگ نمبر 2 لاہور

پروفیسر فتح محمد ملک

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

علامہ اقبالؒ اور مولانا مدنیؒ

ہمارے ایک قابل صد احترام دانشور، فرزند اقبال نے اپنی ایک حالیہ تقریر میں یہ کہہ کر ایک نئی غلط فکری کو جنم دے ڈالا ہے کہ قومیت کے مسئلے پر علامہ اقبالؒ اور مولانا حسین احمد مدنیؒ، ہر دو کا موقف درست تھا۔ گویا علامہ اقبالؒ کا جداگانہ مسلمان قومیت کا تصور بھی برحق ہے مگر مولانا مدنیؒ کی متحدہ ہندوستانی قومیت کی حمایت بھی غلط نہ تھی۔ صرف پاکستان ہی نہیں بلکہ پورے ایشیاء میں مغربی استعمار کی تازہ ترین ریشہ دوانیوں کے پیش نظر اس سراسر غلط طرز فکر کے انتہائی خطرناک مضمرات پر غور و فکر لازم ہے۔

انڈین نیشنل کانگرس متحدہ ہندوستانی قومیت کے تصور کی رو سے پورے برٹش انڈیا کو ایک ملک کی شکل میں متحد رکھنے میں کوشاں تھی۔ انگریز ایک آل انڈیا فیڈریشن کی صورت میں ایک متحدہ ہندوستان کو اپنی جانشین ریاست بنانا چاہتے تھے۔ برطانوی استعمار کی اس حکمت عملی کو امریکی تائید و حمایت بھی حاصل تھی۔ یہ ریاست برطانوی ہند کی تمام قوموں کی جداگانہ شناخت کو مٹا کر ایک متحدہ ہندوستانی قوم کے تصور کی بنیاد پر ہی قائم کی جاسکتی تھی۔ مولانا حسین احمد مدنیؒ نے اسلامیان ہند کی تاریخ کے ایک انتہائی نازک موڑ پر متحدہ ہندوستانی قوم کے تصور کو از روئے اسلام جائز قرار دے کر ہندوستان کو متحد رکھنے کا اسلامی جواز مہیا کیا تھا۔ مولانا مدنیؒ کے اس فتویٰ سے آٹھ سال پہلے علامہ اقبالؒ جداگانہ مسلمان قومیت کی بنیاد پر برصغیر میں جداگانہ، آزادانہ خودمختار مسلمان مملکتوں کے قیام کا تصور پیش کر چکے تھے۔ وہ اسلامیان ہند پر یہ حقیقت روز روشن کی طرح واضح کر چکے تھے کہ متحدہ ہندوستانی قومیت کا مطلب یہ ہے کہ ہم اپنی اجتماعی زندگی کو دین کی قلم رو سے نکال باہر کریں اور دین کو فقط ایک نجی معاملہ قرار دیں۔ متحدہ قومیت کا یہ تصور مسلمانوں سے ان کی منفرد اور جداگانہ دینی شناخت سے دستبردار ہو جانے کا متقاضی ہے مگر اسلامیان ہند یہ راہ ہرگز نہ اختیار کریں گے۔ تاریخ شاہد ہے کہ اسلامیان ہند نے کانگرسی علماء کے فتوؤں کو ٹھکرا کر جداگانہ مسلمان قومیت کا تصور دل و جان سے اپنا لیا۔ رفتہ رفتہ یہ تصور ایک عوامی جمہوری تحریک کا سرچشمہ بن گیا۔ اس تحریک پاکستان نے فقط چند برس کی عوامی جدوجہد کے بعد ہندوستان کی سامراجی وحدت کو توڑ کر پاکستان قائم کر لیا۔

آج جب یہ کہا جاتا ہے کہ وہ فکر و خیال جس کی قوت نے برطانوی ہند کو توڑ کر پاکستان قائم کیا وہ بھی درست ہے اور وہ فکر و خیال بھی درست ہے جو برطانوی ہند کو بھارتی ہند کی شکل میں متحد رکھنے اور یوں قیام پاکستان کو روکنے میں ناکام رہا تو دل

ڈرنے لگتا ہے، یہ کیسے مان لیا جائے کہ اقبالؒ کا تصور پاکستان بھی ٹھیک ہے اور اس تصور پاکستان کی اسلام کے نام پر تردید بھی کچھ ایسی غلط نہیں؟

یہ ایک تاریخی صداقت ہے کہ مغرب کی استعماری حکومتیں آخر دم تک ہندوستان کی سامراجی وحدت کا دم بھرتی رہیں۔ پاکستان کا قیام صرف انڈین نیشنل کانگرس اور انتہا پسند ہندو سیاسی جماعتوں ہی کی ناکامی نہیں بلکہ برطانوی اور امریکی حکمت عملی کی ناکامی بھی ہے۔ چنانچہ قیام پاکستان سے لے کر آج تک مغربی طاقتیں ہندوستان اور پاکستان کو اگر فیڈریشن نہیں تو کنفیڈریشن کی شکل میں متحد کر دینے میں کوشاں ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ایک خارجہ پالیسی اور متحدہ دفاع کی صورت میں یہ مجوزہ کنفیڈریشن (بعد ازاں فیڈریشن) ایشیاء میں مغرب کے نو استعماری مفادات کی یکسوئی کے ساتھ حفاظت کا ''فریضہ'' سرانجام دے سکتی ہے۔ ان نو استعماری عزائم کے پیش نظر جب کوئی پاکستانی دانشور یہ کہتا ہے کہ اقبالؒ تو خیر تھے ہی ٹھیک مگر مولانا مدنیؒ بھی درست تھے تو لگتا ہے کہ ہم نے نظریاتی پسپائی کی راہ اختیار کر لی ہے۔ آج تو ہم یہ کہہ رہے ہیں کہ اقبالؒ اور مدنیؒ دونوں ٹھیک کہتے تھے۔ مگر اندیشہ یہ ہے کہ ہم جلد یا بدیر کہیں اس مقام پر نہ آ پہنچیں جہاں ہمیں یہ محسوس ہونے لگے کہ علامہ اقبالؒ بے شک ہمارے بزرگ ہیں مگر بات مولانا مدنیؒ ہی کی سچی تھی۔ گویا اسلامیان ہند نے پاکستان قائم کر کے ہندوستان کو توڑ ڈالنے کی غلطی کا ارتکاب کیا تھا۔ پھر کسی کوہ ندا سے یہ آواز آنے لگی کہ لوگو! توبہ کا دروازہ ابھی تک کھلا ہے۔ تائب ہو کر عظیم تر ہندوستان کی منزل کی جانب لوٹ آؤ۔ پیشتر اس کے کہ یہ نیا فکری مغالطہ ہمیں پسپائی کے اس مقام پر لا پھینکے ہمیں قومیت کے موضوع پر اقبالؒ اور مدنیؒ کے متضاد خیالات کو ایک بار پھر تاریخی تناظر میں پرکھ لینا چاہئے۔

اپنی وفات سے فقط چند ہفتے پیشتر اقبالؒ مولانا مدنیؒ کا یہ بیان سن کر سناٹے میں آ گئے تھے کہ ''اقوام اوطان سے بنتی ہیں''۔ یہاں میں نے ''سن'' کا لفظ سوچ سمجھ کر استعمال کیا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اقبالؒ کی بینائی جواب دے چکی تھی۔ ایک نوجوان طالب علم میاں محمد شفیع ہر روز علی الصبح آ کر ان کے ساتھ ناشتہ کرتا تھا اور اخبارات پڑھ کر سناتا تھا۔ ایک روز اخبارات کی سرخیاں سناتے وقت وہ یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا کہ اقبالؒ بار بار ایک ہی خبر سنانے کا تقاضا کر رہے ہیں اس نے یہ خبر متعدد مرتبہ سنائی مگر علامہ ہر مرتبہ اس خبر کو پھر سے پڑھنے کا تقاضا کر دیتے تھی اس نوجوان نے جب یہ دیکھا کہ یہ جملہ سن کر کہ ''اقوام اوطان سے بنتی ہیں۔'' علامہ کا ہاتھ وہیں کا وہیں رک گیا۔ ابھی انہوں نے ایک ہی لقمہ توڑا تھا کہ یہ فقرہ کان پڑا تو انہوں نے استفسار فرمایا کہ کیا واقعی مولانا حسین احمد مدنیؒ کا قول ہے۔ جب اس نوجوان نے اثبات میں جواب دیا تو انہوں نے لقمہ واپس پلیٹ میں رکھ دیا اور چاہا کہ وہ اس پوری خبر کو بار بار پڑھے۔ اقبالؒ سنتے رہے اور وہ ان کے چہرے پر درد و کرب کے آثار کو نمایاں سے نمایاں تر ہوتے دیکھتا رہا۔ اس صبح انہوں نے نہ کسی اور خبر کی طرف دھیان دیا اور نہ ہی ناشتہ کیا۔ اٹھ کر اپنے بستر پر لیٹ گئے اور نوجوان سے فرمایا کہ تم اب کالج چلے جاؤ۔

نوجوان میاں محمد شفیع کالج سے جلد از جلد فارغ ہو کر دوبارہ علامہ اقبالؒ کی خدمت میں حاضر ہوا تا کہ باقی ماندہ

اخبارات بھی سنا دے مگر اس نے انہیں انتہائی تکلیف دہ کیفیت میں پایا۔ علی بخش نے بتایا کہ اس وقت سے لے کر اب تک نہ کچھ کھایا پیا ہے اور نہ ہی کوئی بات کی ہے۔ بیماری کی شدت کے باعث بس ایسے ہی لیٹے ہیں۔ کبھی کبھی کوئی آہ یا کراہ سنائی دے جاتی ہے۔ نوجوان گھر چلا گیا۔ شام کو پھر آیا مگر انہیں ویسا ہی چپ چاپ اور گردوپیش سے لاتعلق پایا۔ حسب معمول شام کو ملاقاتی آتے رہے، جاتے رہے۔ علامہ دوسروں کی باتیں سنتے رہے مگر خود کوئی بات نہیں کی۔ دوسری صبح وہ حسب معمول اخبار سنانے حاضر ہوا تو دیکھا کہ علامہ سو رہے ہیں اور چہرے پر اطمینان وسکون کے آثار نمایاں ہیں۔ علی بخش نے بتایا کہ علامہ نے سحر دم کاغذ اور پنسل طلب فرمائی مگر پھر سو گئے اب انہیں جگانا مناسب نہیں۔ تم سیدھے کالج چلے جاؤ۔ اس پر میاں محمد شفیع نے علی بخش سے کہا کہ چپکے چپکے جاؤ اور دیکھو کہ علامہ نے اس کاغذ پر کچھ لکھا بھی ہے یا نہیں؟ علی بخش کاغذ لایا تو کھلا کہ اس پر اقبالؒ نے ''حسین احمدؐ'' کے عنوان سے چند مصرعوں پر مشتمل ایک نظم قلمبند کر دی ہے۔ کالج سے واپسی پر اس نے علامہ کو ہشاش بشاش پایا۔ یہ مختصر نظم دوسرے روز اسی اخبار (روزنامہ ''احسان'' لاہور) میں شائع ہوگئی جس میں ایک روز پہلے مولانا مدنیؒ کا بیان شائع ہوا تھا۔

نوجوان محمد شفیع بعد میں ایک نامور صحافی بن گئے۔ 35 برس کے بعد انہوں نے م۔ش کے قلمی نام سے اپنے یہ مشاہدات ہفت روزہ View Point میں The Birth of a Stanza کے عنوان سے لکھ ڈالے۔ اپنے مشاہدات میں انہوں نے نظم ''حسین احمدؐ'' کے اثر ونفوذ کا ذکر کرتے ہوئے بتایا ہے کہ اس مختصر نظم کی اشاعت نے اسلامیان ہند میں عجب اضطراب کی کیفیت پیدا کر دی۔ نتیجہ یہ کہ مولانا مدنیؒ کو اپنے دفاع میں نت نئے جواز تلاش کرنے پڑے۔ مولانا کی تاویلات پر مشتمل ایک مدلل جواز نامہ ''احسان'' اخبار میں بھی شائع ہوا تھا جس میں مذکورہ بالا نظم کی لفظیات، محاکات اور استعارات پر تاویلات کے پھندے ڈالنے کی کوشش کی گئی تھی۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس نظم کو ایک مرتبہ پھر پڑھ لیا جائے:

عجم ہنوز نداند رموزِ دیں ورنہ
زدیوبندؔ حسین احمدؔ ایں چہ بوالعجبیست
سرود برسرِ ممبر کہ ملّت از وطن است
چہ بے خبر زمقامِ محمدِؐ عربیست
بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبیست

اقبالؒ کے کرب واضطراب کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ وہ مولانا حسین احمد مدنیؒ اور دارالعلوم دیوبند کی دینی خدمات کی دل سے قدر کرتے تھے۔ وہ تصور بھی نہ کر سکتے تھے کہ مولانا مدنیؒ جیسا برگزیدہ عالم دین اور دیوبند جیسا عظیم دارالعلوم اسلام کے سیاسی نصب العین سے اس خوفناک حد تک ناآشنا ہوگا۔ اقبالؒ کے صدمے کی شدت کا اندازہ ان کے اس خیال سے

کیا جا سکتا ہے کہ اگر مولانا مدنیؒ رموزِ دیں سے اس حد تک نابلد ہیں تو پھر پورے عجم میں اسلام کے سیاسی نصب العین سے عدم واقفیت کا ماتم کرنا چاہئے۔ یہ گویا اقبالؒ کی طرف سے دارالعلوم دیوبند اور مولانا مدنیؒ کو ایک طرح کا خراج تحسین ہے۔ تاہم تمام تر احترام کے باوجود اقبالؒ نے دنیائے عجم کو مولانا کے ارشاد میں پنہاں خطرات سے آگاہ کرنا ضروری سمجھا۔

مولانا حسین احمد مدنیؒ دیوبند کے عظیم الشان دارالعلوم کے سربراہ تھے اور ایک زمانے کو ان کی دینی خدمات کا اعتراف ہے، مگر ان کی سیاسی لغزشیں بھی ہماری قومی تاریخ کا حصہ ہیں۔ دلی عقیدت و احترام کے باوجود یہ حقیقت فراموش نہیں کی جا سکتی کہ مولانا حسین احمدؒ تحریک پاکستان کے مخالف تھے۔ ایم اے ایچ اصفہانی، کل ہند مسلم لیگ کے 1936 کے پارلیمانی بورڈ کے اجلاس منعقدہ لاہور کی یادیں قلم بند کرتے وقت مولانا کا تذکرہ درج ذیل الفاظ میں کرتے ہیں:

''مجھے یاد ہے کہ پہلے روز مفتی کفایت اللہ اور مولانا حسین احمد مدنیؒ نے مسٹر جناح کی حمایت کرتے ہوئے مسلم لیگ کو عملی سیاست کے اکھاڑے میں زیادہ فعال حصہ لینے کی تجویز کا خیر مقدم کیا مگر آخری روز ان دو علمائے دین میں سے ایک نے تجویز پیش کی کہ آئندہ عام انتخابات میں مسلم لیگ کی کامیابی یقینی بنانے کی خاطر انتھک اور موثر پراپیگنڈے کی ضرورت ہے۔ اس مقصد کے حصول کی خاطر دیوبند کی مشینری مسلم لیگ کے لئے وقف کی جا سکتی ہے، بشرطیکہ لیگ اس پراپیگنڈہ مہم کے اخراجات برداشت کرے۔ ابتدائی اخراجات کے لئے پچاس ہزار روپے طلب کئے گئے۔ جناح نے صاف بتا دیا کہ نہ تو اس وقت لیگ اتنے پیسے دے سکتی ہے اور نہ آئندہ اس کی توقع ہے۔ اس پر ہر دو علمائے دین مایوس ہو کر ہندو کانگرس کی طرف راغب ہو گئے۔ ہندو کانگرس چونکہ مالی اعانت کا مطالبہ پورا کر سکتی تھی اس لئے اس کا خوب پراپیگنڈہ کیا گیا۔''

(قائداعظم جناح، ایز آئی نیو ہم، صفحات 21-20)

اور نوبت یہاں تک آ پہنچی کہ:

''جن کے علم و تقویٰ پر مدینے کی مہر ثبت تھی، ان کی بابت جواہر لال کا ایک خط شائع ہو گیا کہ حسین احمد کو اتنے روپے دے چکا ہوں، اب وہ اور مانگتے ہیں۔ نہرو نے ان کے نام کے ساتھ نہ مولانا لکھا نہ جناب نہ صاحب۔''

(ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم: اقبالؒ اور ملا، صفحات 17-18)

اب آیئے اقبالؒ کی اس مختصر نظم کے جواب میں مولانا کے بیانات کی جانب۔ اسلام اور قومیت کے موضوع پر مولانا کے سیاسی بیانات کا دقت نظر کے ساتھ مطالعہ کرنے کے بعد اقبالؒ نے روزنامہ ''احسان'' کی 9 مارچ کی اشاعت کے بعد دونوں طرف خاموشی طاری ہو گئی تھی اور یہ تاثر پیدا ہو گیا تھا کہ مولانا نے اپنے سیاسی موقف کی وکالت ترک کر دی ہے۔ مگر ہوا یوں کہ 1940ء کی قرارداد پاکستان کے بعد مولانا حسین احمد مدنیؒ نے ''متحدہ قومیت اور اسلام'' کے عنوان سے ایک مختصر سی کتاب تصنیف کر ڈالی۔ اس کتاب میں انہوں نے متحدہ ہندوستانی قومیت کی بنیاد پر اکھنڈ بھارت کے کانگریسی موقف کے اسلامی جواز پیش کر رکھے ہیں۔ مولانا نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ پاکستان کا تصور اور پاکستان کی تحریک ہر دو

اسلام کے منافی ہیں اس لئے اسلامیان ہند کو مسلم لیگ کی بجائے انڈین نیشنل کانگریس میں شامل ہو کر اپنے وطن ہندوستان کو متحد رکھنا چاہیئے۔

یہ ہماری خوش بختی ہے کہ علامہ اقبالؒ بستر مرگ سے ہی علمائے ہند کے ساتھ اسلام اور قومیت کے موضوع پر اپنا آخری فکری معرکہ سر کر گئے تھے۔ اس موضوع پر مولانا مدنیؒ کے جواب میں علامہ اقبالؒ کا بیان ان کا آخری سیاسی بیان ہے۔ اس بیان میں اقبالؒ کا استدلال بے مثال سیاسی بصیرت اور نادر و نایاب دینی شعور کی یکجائی سے پھوٹا ہے۔ اقبالؒ کا کہنا یہ ہے کہ اگر وطن اتحاد انسانی کی بنیاد ہوتا تو آنحضور ﷺ اسلام کی سربلندی کی خاطر اپنے وطن مکہ کو چھوڑ کر مدینہ ہجرت نہ کرتے۔ آنحضورؐ کی ہجرت میں یہ دینی و سیاسی رمز بھی پوشیدہ ہے کہ اسلام میں قومیت کا بنیادی اور اٹل اصول روحانی یگانگت ہے نہ کہ وطنی اشتراک۔ ہر چند قوم وطن سے نہیں بنتی مگر قوم کو ایک وطن کی ضرورت ہوتی ہے اسی ضرورت کے پیش نظر اقبالؒ نے جداگانہ مسلمان قومیت کی بنیاد پر پہلے پاکستان کا تصور دیا اور پھر اس تصور کو ایک عوامی جمہوری تحریک میں بدلنے کا سامان کیا۔ عوامی جمہوری تحریک نے بال آخر متحدہ قومیت اور متحدہ ہندوستان کے تصور کو رد کر کے ہماری روحانی یگانگت کو برگ و بار لانے اور پھلنے پھولنے کے لئے یہ خطہ پاک عطا کیا جس میں بیٹھے آج ہم اس چیستان کو حل کرنے میں کوشاں ہیں کہ قومیت کے مسئلے پر اگر اقبالؒ کا موقف بھی درست تھا اور مولانا مدنیؒ کا فتویٰ بھی ٹھیک تھا تو کیونکر؟

نہیں صاحب! اقبالؒ ٹھیک تھے اور مولانا مدنیؒ غلط تھے۔ بات یہ ہے کہ مولانا مدنیؒ بھی انہی علمائے کرام میں سے ایک ہیں جو تحریک خلافت کی ناکامی اور ترکی میں نظام خلافت کی تنسیخ کے بعد اسلام کے اجتماعی مقدر سے مایوس ہو کر انڈین نیشنل کانگرس کی سرپرستی میں چلے گئے تھے۔ ان ہی برگزیدہ علمائے دین اور ان کی سیاسی جماعتوں کی جانب زیر لب اشارہ کرتے ہوئے اقبالؒ نے اپنے خطبہ الہٰ آباد میں کہنا ضروری سمجھا تھا کہ:

'To address this session of the All-India Muslim League you have selected a man who is not despaired of Islam as a living force for freeing the outlook of man from its geographical limitations, who believes that religion is a power of the utmost importance in the life of individuals as well as States, and finally who believes that Islam is itself a Destiny and will not suffer a destiny. Such a man cannot but look at matters from his own point of view.'

یہاں اقبال کا زیر لب اشارہ قابل غور ہے۔ یہ ایک تاریخی صداقت ہے کہ 1930ء میں ایک اقبالؒ کو چھوڑ کر باقی تمام مسلمان قائدین اسلام کے اجتماعی مقدر سے عملاً مایوس تھے۔ بیشتر مذہبی سیاسی جماعتیں براہ راست یا بالواسطہ متحدہ ہندوستان

کا دم بھرنے میں مصروف تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ اقبالؒ نے مولانا مدنیؒ کے سیاسی موقف کی تردید کرتے ہوئے اپنی آخری نثری تحریر میں یہ کہنا ضروری سمجھا تھا کہ:

''یورپ کی ملوکانہ اغراض اس امر کی متقاضی ہیں کہ اسلام کی وحدت دینی کو پارہ پارہ کرنے کے لئے اس سے بہتر اور کوئی حربہ نہیں کہ اسلامی ممالک میں فرنگی نظریہ وطنیت کی اشاعت کی جائے۔ چنانچہ ان لوگوں کی یہ تدبیر جنگ عظیم میں کامیاب بھی ہوگئی اور اس کی انتہا یہ ہے کہ ہندوستان میں اب مسلمانوں کے بعض دینی پیشوا بھی اس کے حامی نظر آتے ہیں۔ زمانے کا الٹ پھیر بھی عجیب ہے ایک وقت تھا کہ ہم مغرب زدہ پڑھے لکھے مسلمان تفریح میں گرفتار تھے اب علماء اس لعنت میں گرفتار ہیں۔''

یہاں اس بات کا تذکرہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان دینی پیشواؤں میں مولانا عبیداللہ سندھیؒ اور سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے سے جدیدیت پسند علماء بھی شامل ہیں۔ ہر دو نے قرارداد پاکستان کے بعد اپنی اپنی سیاسی جماعتوں کا ڈول ڈالا۔ مولانا سندھیؒ نے ترکی میں اپنی جلاوطنی کے زمانے میں ہی اسلامی اتحاد کے خوابوں سے دستبرداری کا کھلم کھلا اعلان کر دیا تھا۔ استنبول سے انہوں نے ریاست ہائے متحدہ ہندوستان کا جو خاکہ شائع کیا تھا اس میں انہوں نے یہ اعلان کیا تھا کہ ان کی جلاوطن سوراجیہ ہند پارٹی' انڈین نیشنل کانگرس ہی کا ایک ذیلی گروہ ہے جو مذہب کو فقط ذاتی زندگی کے دائرے تک محدود رکھتے ہوئے لسانی اور جغرافیائی بنیادوں پر ہندوستان کو دس ریاستوں کے ایک وفاق کی صورت میں متحد رکھنے کا خواہاں ہے۔ اسلامیان ہند میں قرارداد پاکستان کی روز افزوں مقبولیت کے زمانے میں جب انہوں نے ''جمنا' نربدا' سندھ' ساگر پارٹی'' قائم کی تب بھی ایک متحدہ ہندوستان کی بقا ہی کو اپنا سیاسی مسلک قرار دیا۔

سید ابوالاعلیٰ مودودی نے ''مسئلہ قومیت'' کے عنوان سے اپنے کتابچہ میں جداگانہ مسلمان قومیت سمیت ہر نوع کی قومیت کو اسلام سے متصادم ٹھہرایا اور تحریک پاکستان کے حامیوں اور رہنماؤں کو بھی کانگرسی مسلمانوں ہی کی مانند گردن زدنی ٹھہرایا۔ مودودی صاحب کے خیال میں اسلام اور قومیت میں بنیادی تضاد ہے۔ اپنی کتاب ''مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش'' کی جلد سوم میں انہوں نے ''جداگانہ مسلم قومیت (یعنی پاکستان) کے تصور کو ایک غیر اسلامی بلکہ ''اسلام دشمن تصور'' قرار دیا ہے۔ یہاں مجھے اقبالؒ کا وہ تلخ سوال یاد آ گیا ہے جو انہوں نے درج ذیل شعر میں اٹھایا تھا:

مجھ کو تو سکھا دی ہے افرنگ نے زندیقی
اس دور کے مُلا ہیں کیوں ننگِ مسلمانی؟

مولانا حسین احمد مدنیؒ کے جواب میں علامہ اقبالؒ نے اس تلخ حقیقت کا واشگاف اعلان کیا ہے کہ ''اب علماء اس لعنت میں گرفتار ہیں''۔ چونکہ اقبالؒ کا ہمعصر مُلا اسلام کے لئے باعث ننگ و عار بن کر رہ گیا ہے اس لئے یہ ضروری ہو گیا ہے کہ اقبالؒ اس پر اسلام کی حقیقی روح کو منکشف کریں۔ فرماتے ہیں:

''جو کچھ قرآن سے میری سمجھ میں آیا ہے اس کی رو سے اسلام محض انسان کی اخلاقی اصلاح ہی کا داعی نہیں بلکہ عالم بشریت کی اجتماعی زندگی میں ایک تدریجی مگر اساسی انقلاب بھی چاہتا ہے جو اس کے قومی اور نسلی نقطہ نگاہ کو یکسر بدل کر اس میں خالص انسانی ضمیر کی تخلیق کرے.....مولانا حسین احمد عالم دین ہیں اور جو نظریہ انہوں نے قوم کے سامنے پیش کیا ہے امت محمدیہ کے لئے اس کے خطرناک عواقب سے وہ بے خبر نہیں ہو سکتے.....آپ نے سوچا نہیں کہ آپ اس توضیح سے دو غلط اور خطرناک نظریے مسلمانوں کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔ ایک یہ کہ مسلمان بحیثیت قوم اَور ہو سکتے ہیں اور بحیثیت ملت اَور۔ دوسرا یہ کہ از روئے قوم چونکہ وہ ہندوستانی ہیں اس لئے مذہب کو علیحدہ چھوڑ کر انہیں باقی اقوام ہند کی قومیت یا ہندوستانیت میں جذب ہو جانا چاہئے.....یعنی یہ کہ مذہب اور سیاست جدا جدا چیزیں ہیں۔ اس ملک میں رہنا ہے تو مذہب کو محض انفرادی اور پرائیویٹ چیز سمجھو اور اس کو افراد تک ہی محدود رکھو، سیاسی اعتبار سے مسلمانوں کو کوئی دوسری علیحدہ قوم تصور نہ کرو اور اکثریت میں مدغم ہو جاؤ۔''

ہندوستان میں دین و وطن کی اس کشمکش پر اسلام کی انقلابی تعلیمات کی روشنی ڈالتے ہوئے اقبالؒ مولانا مدنیؒ کو اس حقیقت کی جانب متوجہ کرتے ہیں کہ:

''حضور رسالتمآبؐ کے لئے یہ راہ بہت آسان تھی کہ آپ ابولہب یا ابوجہل یا کفار مکہ سے یہ فرماتے کہ تم اپنی بت پرستی پر قائم رہو، ہم اپنی خدا پرستی پر قائم رہتے ہیں مگر اس نسلی اور وطنی اشتراک کی بناء پر جو ہمارے اور تمہارے درمیان موجود ہے ایک وحدت عربیہ قائم کی جا سکتی ہے۔ اگر حضورؐ نعوذ باللہ یہ راہ اختیار کرتے تو اس میں شک نہیں کہ یہ ایک وطن دوست کی راہ ہوتی لیکن نبی آخرالزماںؐ کی راہ نہ ہوتی۔ نبوت محمدیہ کی غایت الغایات یہ ہے کہ ایک ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ قائم کی جائے جس کی تشکیل اس قانون الٰہی کے تابع ہو جو نبوت محمدیہ کو بارگاہ الٰہی سے عطا ہوا تھا.....یقین جانئے کہ دین اسلام ایک پوشیدہ اور غیر محسوس حیاتی اور نفسیاتی عمل ہے جو بغیر کسی تبلیغی کوششوں کے بھی عالم انسانی کے فکر و عمل کو متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ ایسے عمل کو حال کے سیاسی مفکرین کی جدت طرازیوں سے مسخ کرنا ظلم عظیم ہے، بنی نوع انسان پر اور اس نبوت کی ہمہ گیری پر جس کے قلب و ضمیر سے اس کا آغاز ہوا۔''

اس بیان میں اقبالؒ نے یہ حقیقت ایک مرتبہ پھر واضح کر دی ہے کہ حب وطن اور چیز ہے اور وطنیت اور چیز۔ وطن ایک خطۂ خاک ہے جس پر انسان اپنی عارضی زندگی بسر کرتا ہے۔ وطن سے محبت ایک فطری جذبہ ہے۔ اسلام حب وطن کو برحق قرار دیتا ہے مگر وطنیت کے جدید فرنگی نظریے کو رد کر دیتا ہے۔ وطنیت کے اس سیاسی تصور کا حب وطن کے فطری جذبے سے کوئی تعلق نہیں:

''زمانہ حال کے سیاسی لٹریچر میں ''وطن'' کا مفہوم محض جغرافیائی نہیں بلکہ وطن ایک اصول ہے ہیئت اجتماعیہ انسانیہ کا اور اس اعتبار سے ایک سیاسی تصور ہے چونکہ اسلام بھی ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ کا ایک قانون ہے اس لئے جب لفظ ''وطن'' کو ایک

سیاسی تصور کے طور پر استعمال کیا جائے تو وہ اسلام سے متصادم ہو رہا ہے۔ مولانا حسین احمد صاحب سے بہتر اس بات کو کون جانتا ہے کہ اسلام ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ کے اصول کی حیثیت میں کوئی لچک اپنے اندر نہیں رکھتا اور ہیئت اجتماعیہ انسانیہ کے کسی اور آئین سے کسی قسم کا راضی نامہ یا سمجھوتہ کرنے کو تیار نہیں۔''

وطنیت ایک جدید فرنگی نظریہ ہے جس کے انسان دشمن مضمرات کو اقبالؒ نے اپنے آخری سیاسی بیان سے ربع صدی پیشتر اپنی نظم ''وطنیت'' میں بے نقاب کیا تھا۔ حب وطن اور وطنیت کے تضادات کو نمایاں کرنے کے لئے اقبالؒ نے اپنی اس نظم کو ایک ذیلی عنوان بھی دیا ہے جو یوں ہے: ''یعنی وطن بحیثیت ایک سیاسی تصور کے''۔ آیئے آگے بڑھنے سے پہلے اس نظم پر بھی ایک نظر ڈال لیں:

اس دور میں مے اور ہے، جام اور ہے جم اور
ساقی نے بنا کی روشِ لطف و ستم اور
مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور
تہذیب کے آذر نے ترشوائے صنم اور
ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے، وہ مذہب کا کفن ہے
یہ بت کہ تراشیدۂ تہذیبِ نوی ہے
غارت گرِ کاشانۂ دینِ نبوی ہے
بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے
اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے
نظارۂ دیرینہ زمانے کو دکھا دے
اے مصطفوی خاک میں اس بُت کو ملا دے!
ہو قیدِ مقامی تو نتیجہ ہے تباہی
رہ بحر میں آزادِ وطن صورتِ ماہی
ہے ترکِ وطن سنتِ محبوبِؐ الٰہی
دے تُو بھی نبوت کی صداقت پہ گواہی
گفتارِ سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے
ارشادِ نبوت میں وطن اور ہی کچھ ہے

اقوامِ جہاں میں ہے رقابت تو اسی سے
تسخیر ہے مقصودِ تجارت تو اسی سے
خالی ہے صداقت سے سیاست تو اسی سے
کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے
اقوام میں مخلوقِ خدا بٹتی ہے اس سے
قومیتِ اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

اقبالؒ نے اپنی نظم میں جغرافیائی قومیت کی استعماری بنیادوں کو بڑے سادہ، سلیس اور موثر انداز میں بے نقاب کیا ہے۔ جغرافیائی قومیت (وطنیت) کی سیاسی آئیڈیالوجی کی بنیاد وطن نہیں بلکہ تجارتی لوٹ کھسوٹ اور سیاسی جبر و استبداد ہے۔ تسخیر ہے مقصودِ تجارت تو اسی سے، کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے۔ مزید برآں خلقِ خدا کو یہ آئیڈیالوجی متحارب اقوام میں بانٹ کر اسلامی قومیت کی آفاقی جڑ کاٹ کر رکھ دیتی ہے۔ اقبالؒ اس نظریاتی وطنیت کو ایک ایسا بت قرار دیتے ہیں جسے مغربی سامراج نے تراشا ہے۔ اسلام اس بت کی پرستش کی اجازت نہیں دیتا۔ پس مسلمانوں کو چاہئے کہ محبوبؐ خدا کی سنت پر عمل کرتے ہوئے اس سیاسی وطنیت کے تصور کو ٹھکرا دیں۔ دین اسلام ہی مسلمانوں کا حقیقی وطن ہے۔ وطن اور وطنیت کے فرق کو نمایاں کرتے ہوئے اقبالؒ بڑی قطعیت کے ساتھ بتاتے ہیں کہ:

گفتارِ سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے
ارشادِ نبوت میں وطن اور ہی کچھ ہے

اقبالؒ وطنیت کے سیاسی تصور پر مبنی ہندوستانیت کو رد کرتے وقت ارضی اشتراک کی بجائے روحانی یگانگت کو اپنی قومیت کی بنیاد ٹھہراتے ہیں۔ اقبالؒ نے اپنی فارسی اور اردو شاعری میں جداگانہ مسلمان قومیت کا یہ تصور پیش کرتے وقت ہمیشہ آنحضورؐ کے طرزِ فکر و عمل کو اپنی استدلال کی بنیاد بنایا ہے۔ ''اسرار و رموز'' سے لے کر ارمغانِ حجاز تک انہوں نے محمد ﷺ سے وفاداری بشرطِ استواری ہی کو حقیقی اسلام قرار دیا ہے۔ اپنی اردو نظم ''جوابِ شکوہ'' میں انہوں نے خدا کی زبان سے یہ نوید سنائی ہے کہ: ؎

کی محمد ﷺ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

اپنے آخری سیاسی بیان میں بھی اقبالؒ نے قومیت کے مسئلے پر مولانا حسین احمد مدنیؒ کے موقف کی ''نبوتِ محمدیہ کی غایت الغایات'' کے حوالے سے ہی تردید کی ہے۔ یہ غایت ایک ایسے آفاقی انسانی معاشرے کا قیام ہے ''جس کی تشکیل اس قانونِ الٰہی کے تابع ہو جو نبوت محمدیہ کو بارگاہ الٰہی سے عطا ہوا تھا۔'' متحدہ ہندوستانی قومیت کے تصور کو اپنا کر ہندو اکثریت

کے متحدہ ہندوستان میں اسلام کی بنیاد پر کسی ایسے آفاقی انسانی معاشرے کا قیام ہرگز ہرگز دائرہ امکان میں نہیں۔ ایسے میں مسلمانوں پر دو ہی راستے کھلے ہیں یا تو وہ ترکِ اسلام کی راہ اپنا کر ہندو تہذیب میں جذب ہو جائیں اور یا پھر ہندوستانی وطنیت کے بت کو توڑ کر جداگانہ مسلمان قومیت کی بنیاد پر اپنے لئے ایک الگ خطہ زمین کے حصول کی تحریک چلائیں۔

اگر خدانخواستہ، ہندی مسلمان فکر اقبالؒ سے روشنی لینے کی بجائے مولانا حسین احمد مدنیؒ اور ان کے ہمعصر کانگریسی علماء کے فتوؤں کے جال میں اسیر ہو کر رہ جاتے تو یہ بلاشبہ ترکِ اسلام کی راہ ہوتی۔ پہلے اسلام کا سیاسی نصب العین ترک کر کے ہندوستانیت کا سیکولر نصب العین اپناتے اور پھر رفتہ رفتہ اسلام کا اخلاقی نصب العین بھی ترک کر کے، حضرت مجدد الف ثانیؒ کے لفظوں میں ''مسلمانان ہندومزاج'' بن کر رہ جاتے۔

سرکردہ علمائے دین کا متحدہ ہندوستانی قومیت پر ایمان لے آنا یا دوسرے لفظوں میں، سب سے پہلے ہندوستان، اور آخر میں اسلام، کا سیاسی مسلک اپنا لینا ایک ایسی دلخراش حقیقت تھی جو پایانِ عمر، اقبالؒ کے لئے سوہانِ روح بن کر رہ گئی تھی۔ جداگانہ مسلمان قومیت اور متحدہ ہندوستانی قومیت کے مابین نظریاتی آویزش کو اقبالؒ نے دین و وطن کی کشمکش یا روح و بدن کی معرکہ آرائی کا نام دیا ہے۔ دین کے اجتماعی مسلک سے بیشتر علمائے دین کی کنارہ کشی کے ہولناک نتائج کا خیال کر کے اقبال کا دل کانپ کانپ اٹھتا تھا۔ ایسے میں وہ تڑپ کر یہ سوال اٹھایا کرتے تھے کہ: ؎

بڑھ کے خیبر سے ہے یہ معرکہ دین و وطن
اس زمانے میں کوئی حیدر کرار بھی ہے؟

یہ اقبال کی شاعری اور اقبال کی فکر کا فیضان ہے کہ جب متحدہ ہندوستانی قومیت یا جداگانہ مسلمان قومیت یعنی متحدہ ہندوستان یا قیام پاکستان میں سے کسی ایک راہ فکر و عمل کے انتخاب کا وقت آیا تو سوادِ اعظم نے اقبال کی فکری اور قائداعظم کی سیاسی قیادت میں قیام پاکستان کی حمایت کی۔ یوں بال آخر اسلامیان ہند کی اجتماعی رائے نے کانگرسی علماء کے تصور اسلام کو رد کرتے ہوئے اقبالؒ کے تصور اسلام کو اسلام کی حقیقی تعبیر مان لیا۔

اس حقیقی اسلام کی سربلندی کی خاطر 1947ء میں پاکستان قائم ہو گیا مگر آج تک پاکستان میں اسلام کی انقلابی تعبیر کو عملی جامہ پہنانے کا سامان نہ ہو سکا۔ یہ اسی غفلت کا شاخسانہ ہے کہ آج ہمارے ہاں پھر سے اسی شکست خوردہ ذہنیت کے مظاہر سامنے آ رہے ہیں جن کا مشاہدہ بیسویں صدی کی تیسری اور چوتھی دہائی متذکرہ بالا علماء کی ذہنیت میں کر چکی ہی تب اور اب میں فرق صرف اتنا ہے کہ کل اگر چند علماء فرنگی نظریات کو مشرف بہ اسلام کرنے میں سرگرداں تھے تو آج یہ کام علماء کی بجائے جدیدیت پسند دانشور کر رہے ہیں۔ اسے کہتے ہیں زمانے کا الٹ پھیر!

(بشکریہ نوائے وقت)

جمیل احمد عدیل

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فکرِ پرویز۔۔۔ایک مختصر ترین تاثر

جہاں تک ہمیں یاد پڑتا ہے، یہ کوئی تیس بتیس سال پرانی بات ہے، یعنی یہی کوئی آٹھ دس برس کی عمر میں ہماری سماعت سے یہ فقرہ ٹکرایا تھا، ''لو جی! مسلمانوں میں پرویزیوں کے نام سے ایک نیا فرقہ ایجاد ہو گیا ہے۔'' یہ الفاظ ہمارے ایک پیر پرست مہربان کی زبان سے ادا ہوئے تھے۔ یہ صاحب پاکپتن میں ہمارے میزبان تھے۔ یہ تھا ''فکرِ پرویز'' سے ہمارا پہلا تعارف۔ عہدِ طفولیت میں بھلا ہمیں اس ''فرقے'' سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی، تاہم تجسس کا پہلا بیج اسی دن بو یا گیا۔ کئی سال گزر گئے، لیکن نہ جانے کیوں متذکرہ نیم طنزیہ تعارفی جملہ ہمیں بھولا نہیں، تا آنکہ ہمیں دسویں جماعت میں ایک بزرگ استاد کے روبرو زانوئے تلمذ تہہ کرنے کا موقع ملا۔ رحیم بھٹہ صاحب اس ہستی کا اسم گرامی ہے۔ جواب کافی معمر ہو چکے ہیں۔ ''جماعت احمدیہ'' کے برگزیدوں میں شمار ہوتے ہیں۔ ہمیں رحیم صاحب کے بے حد احترام کے باوجود ان کے مذہبی اعتقادات سے اتفاق نہیں ہے۔ ان کے متعلق اور کیا کہیں بس غالبؔ کا یہ شعر عرض کر سکتے ہیں ؎

لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں
مانا کہ اِک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے

اس عاجز پر رحیم صاحب کے لاتعداد احسانات میں سے سرفہرست یہ ہے کہ انہوں نے ہمیں ''فکر پرویز'' سے باقاعدہ متعارف کروایا۔ ان کی وساطت سے ہی غلام احمد پرویز کی تصنیف ''قتلِ مرتد'' ہمیں ملی۔ میٹرک کا سٹوڈنٹ ایک علمی کتاب سے جتنا استفادہ کر سکتا ہے، ہم نے بھی کیا۔ آپ اس سے اندازہ کر لیں کہ کم و بیش ربع صدی گزر جانے کے باوصف نہ صرف اس کتاب کے مندرجات ہمیں اچھی طرح یاد ہیں بلکہ اس حوالے سے پرویز صاحب کے مثبت نقطہ نظر نے مستقل ہمارے قلب و ذہن میں جگہ بنا لی۔ بعد میں ایسی کئی تقریریں اور تحریریں ہماری سماعتوں اور بصارتوں سے ٹکرائیں جن میں ارتداد کو جرم ثابت کرنے کے لئے بعض روایتی سوچ رکھنے والوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا تھا، لیکن سچی بات ہے ان کی ایک بات بھی دل کو نہ لگی۔ اسی طرح غلاموں اور لونڈیوں کے متعلق پرویز صاحب نے جو صراحت کی، وہ اتنی معقول ہے کہ اس کا ہر جواب پوچ ہے۔ بعض علمی مجالس میں ہم نے ''رسک'' لے کر اس باب میں بعض ثقہ علماء کرام سے براہ راست استفسارات کر کے بھی

دیکھ لیا' لیکن جواباً ہمیں قابل رحم عجز کا مشاہدہ ہی کرنا پڑا اور ہم سوچتے ہی رہ گئے کہ محض ایک شخص کی معاندت اور غیر مستند تاریخ وروایات کی صنم پرستی نے انہیں کیسے دن دکھا دیئے ہیں کہ کائنات کی پاکیزہ ترین شخصیت ﷺ کا تقدس بھی انہیں عزیز نہیں رہا کہ بلا جھجک زبان پر ایسی ناروا باتیں لے آتے ہیں کہ حضور ﷺ سے محبت رکھنے والے ایک عام اور گنہگار مسلمان کی روح بھی کانپ اٹھتی ہے۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ انہیں راستی کا راستہ دکھائے۔

قصہ مختصر علم وادب سے وابستگی جیسے جیسے پختگی کے مراحل طے کرتی گئی غلام احمد پرویز مرحوم کی تصانیف کا مطالعہ جاری رہا۔ اگرچہ اس دوران میں کئی پڑاؤ آئے' طویل وقفے بھی آئے ؎

گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

1983-85ء کا عرصہ بی۔اے کے طالب علم کی حیثیت سے ایف سی کالج میں گزرا۔ ہوسٹل میں مقیم رہے۔ اچھی طرح معلوم تھا کہ 25/B گلبرگ 2۔ پرویز صاحب کی رہائش ہے۔ یہ بھی خبر تھی کہ آپ ہر ہفتے درس قرآن دیتے ہیں۔ ''ثواب طاعت وزہد'' جاننے کے علی الرغم جانے کیوں طبیعت ادھر نہیں آئی۔ تعلق خاطر جانے کس کس نوع کے دار ورسن کی اور لئے پھرا بس ادھر رخ نہ ہوسکا ''ورنہ قریب تر تھا شبستاں کھلا ہوا''۔ حقیقت یہ ہے سب سے بڑی نعمت' نعمت کی موجودگی کا احساس ہے اور ہمیں بھی اس نعمت کا احساس اس دن ہوا جب یہ نعمت روئے ارض پر موجود نہ رہی۔ ایک دم قدرت اللہ شہاب کے افسانے ''چندراوتی'' کا پہلا فقرہ یاد آیا ہے:

''جب مجھے چندراوتی سے محبت شروع ہوئی۔ اسے مرے ہوئے تیسرا روز تھا.....''۔

صاحبو! ہم وہ تاریخی دن کیسے بھول سکتے ہیں' جی ہاں 25 فروری 1985ء (1 ؎) ہم اپنے کزن سے ملنے ایف۔سی کالج سے ریواز گارڈن گئے۔ واضح رہے ان دنوں ہمارے پاس ایگل کی بائیسکل ہوا کرتی تھی اور پورا لاہور اس کے دو پہیوں کی گردش میں سمٹنے پر مجبور بلکہ ''مجبورِ محض'' تھا۔ وہیں ریواز گارڈن میں اخبار کے پہلے صفحے پر ہماری نظر پڑی' پرویز صاحب کے سانحہ ارتحال کی خبر نے بے کل کر دیا۔ ان کی موت سے زیادہ افسوس ہمیں یہ لاحق ہوگیا کہ اتنا قریب ہونے کے باوجود ان سے مل نہیں سکے' انہیں سن نہیں سکے' ان کی زیارت نہیں کر سکے۔ اسی تاسف نے جسم وجاں میں ایک عجیب سی توانائی بھر دی' اپنی سائیکل اٹھائی' ریواز گارڈن سے سیدھے 25/B گلبرگ پہنچے۔ سفر آخرت کی تیاریاں ہو چکی تھیں۔ پرویز صاحب ایک چارپائی پر پڑے ابدی نیند سو رہے تھے۔ ان سے محبت کرنے والے ان گنت احباب اردگرد موجود تھے' کہیں آنسو رواں ہیں' کہیں دبی دبی سسکیاں تو کہیں قدرے بلند آواز میں گریہ۔ پرویز صاحب کے بھائی (مرحوم) ڈاکٹر عارف بٹالوی سب کو تسلیاں بھی دیتے جاتے تھے اور خود روتے بھی جا رہے تھے۔ ہم نے بار بار جی بھر کے اس عظیم انسان کو دیکھا جس نے ایک عہد کو متاثر کیا تھا۔ برآمدے میں ایک عمر رسیدہ شخص اونچی آواز میں اپنے محسن پرویز صاحب کو یاد کر رہا تھا۔ اس کا نام مرزا

سلطان بیگ (نظام دین) تھا۔ جنازہ روانہ ہوا۔ ہم بھی اس جلوس میں شامل رہے۔ منی مارکیٹ کی گراؤنڈ میں نماز جنازہ ادا کی گئی۔ تدفین کا مرحلہ آیا تو بھی ہم موجود رہے۔ ہمیں اچھی طرح یاد ہے ان کے کسی عزیز نے دور سے (غالباً کراچی سے) پہنچنا تھا' چنانچہ تدفین کے مرحلے کو کچھ مؤخر کر دیا گیا کہ فلائٹ کا انتظار کیا جانے لگا۔ اس دوران میں کہ ان کی آخری آرامگاہ تیار ہو چکی تھی' پاس چارپائی پر ان کی میت پڑی تھی۔ قریب ہی جناب حنیف رامے نے اپنی چادر بچھا دی۔ ہم لوگ ان کے کہنے پر وہاں بیٹھ گئے۔ ان دنوں رامے صاحب کا ایک مضمون جو روزنامہ ''جنگ'' میں چھپا تھا' بے حد متنازع ہونے کی وجہ سے ہر حلقے میں موضوع گفتگو بنا ہوا تھا۔ اس خاکسار نے اس مضمون کی بابت رامے صاحب سے جو دو ایک سوالات پوچھے تو اچھی خاصی محفل جم گئی۔ بڑی گرما گرم باتیں ہوئیں۔ واپس آ کر اس گفتگو کے تضمنات پر مبنی اور پرویز صاحب کے آخری سفر کی روداد' جو دس بارہ صفحات پر مشتمل تھی' ہم نے رحیم صاحب کو خط کی صورت میں بھیجی تھی' کیا عجب ان کے پاس یہ مفصل خط محفوظ ہو۔

بہرنوع وقت کا دریا اپنے غیر متعین تعینات کے ساتھ بہتا رہا۔ ہم ''طلوع اسلام'' کا باقاعدگی سے مطالعہ کرتے رہے۔ ایک آدھ کنونشن میں شریک ہونے کی سعادت بھی ملی۔ کبھی کبھار پرویز صاحب کی کسی کتاب میں سے بھی گزرنے کا موقع ملتا رہا۔ ''فکر پرویز'' سے تعلق رکھنے والے دوستوں' اسلم صابر صاحب' محمود الحسن صاحب' ڈاکٹر اسلم نوید صاحب اور دیگر منسلکین سے رابطے رہے' مکالمات کا تبادلہ ہوتا رہا' ذہنی افق پھیلتا رہا۔ لیکن حق یہ ہے کہ پرویز کو پڑھنے اور سمجھنے کا حق ابھی ادا نہیں ہوا تھا۔ اب سے کوئی تین سال قبل کی بات ہے کہ یہ عاجز بسلسلہ ملازمت ساہیوال میں مقیم تھا۔ وضاحت کر دیں کہ ہمارا تعلق شعبہ تدریس سے ہے۔ کوئی 15/16 سال ہو گئے ہیں' مختلف کالجوں میں پڑھاتے ہوئے۔ 2001ء میں جب ڈسٹرکٹ گورنمنٹس کا ڈول ڈالا گیا تو ہماری رضا معلوم کیئے بغیر ''جبراً'' ہمیں کلاس روم سے اٹھا کر آفس میں بھیج دیا گیا۔ ممکن ہے عامیوں کی نگاہ میں ''ڈائریکٹر کالجز'' ہونا عزت کی بات ہو پر ہمیں تو یہ سراسر قید بامشقت کے مشابہ عمل محسوس ہوا۔ لہٰذا دو اڑھائی سال مسلسل سفارشیں ڈھونڈتے رہے کہ کوئی ''رجل غیب'' ہمیں اس جھنجٹ سے نجات دلا دے' ہم باز آئے اس ''ایجوکیشن افسری'' سے۔ سیدھی سی بات ہے ہم تو انہیں لفظ و حرف ہی ماننے کو تیار نہیں جو لٹریچر (علم و ادب) سے واسطہ نہ رکھتے ہوں اور یہاں تو اعداد تھے' ہندسے تھے' لایعنی میٹنگز تھیں' انکوائریاں تھیں ٹیکنیکل انسپیکشنز تھیں' فزیبلٹی رپورٹس تھیں' Expenditure State Ments تھیں' آڈٹ تھے' جی حضوری کی ایک زنجیر تھی۔ دستور یہی تھا کہ اوپر والوں کی ہر نامعقول بات ہنسی خوشی سہو اور نیچے والوں پر خوب خوب رعب گانٹھو۔ کیا عرض کریں اس افسری لائن میں تلخیاں ہی تلخیاں تھیں' چنانچہ اب بھی یہ گنگناتے رہتے ہیں' ''جنہیں ہم بھولنا چاہیں وہ ''افسر'' یاد آتے ہیں۔''

خیر وہ جسے Good out of Evil کہتے ہیں۔ اس کی رو سے مذکورہ اذیت بلکہ ''شر'' میں سے ہمیں بھی خیر کے کچھ پہلو ضرور ملے۔ میر دردؔ نے کیا عمدہ شعر کہا ہے ؎

خیر و شر کو سمجھ کہ ہیں دو زہر
سانپ کی زیست ہی تجھے سم ہے

یہ درست کہ لمحۂ موجود میں ہم آزاد ہیں' اس ''سمناک'' ماحول سے ہمیں چھٹکارا مل چکا ہے لیکن یہ بہت بڑا سچ ہے کہ اگر اس Misery کا ہمیں ذاتی طور پر تجربہ نہ ہوا ہوتا' زندگی کی سفاک جہتوں کے ہم خود شاہد نہ ہوتے تو ممکن ہے پرویز صاحب کی تصانیف میں موجود ''زندگی کے زہر'' کو نوشِ جاں کرنے کی صلاحیت سے عاری رہتے۔ وہی بات ؎

گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلّی' نہ طُور پر
دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

صاحبو! آپ ذرا سوچئے وہ فرد جس نے چالیس برس مذہبی گھرانے' مذہبی معاشرے میں بتائے ہوں کیا وہ مذہب کے بغیر لقمہ بھی توڑ سکتا ہے؟ نہیں جناب یہ قریب قریب ناممکن ہے۔ اس فرد کے طرزِ احساس کی بُنت میں مذہب کا Fibre بنیادی تانے بانے کے طور پر شامل ہو جاتا ہے۔ ہاں اگر اتفاق سے کوئی ایسا واقعہ اس فرد کے ساتھ پیش آ جائے کہ اسے ''بدنصیبی'' سے اپنے مخصوص مذہبی نظریات کو خالص معروضیات کی دھوپ میں کھینچنا پڑ جائے' غیر جانبدار ہو کر ان کا جائزہ لینا پڑ جائے' ہر خوش عقیدگی کو منہا کر کے ان کا تجزیہ کرنا پڑ جائے تو عین ممکن ہے نتائج کی بے رحم صورت دیکھ کر اس فرد کو ہارٹ اٹیک آ جائے اور وہ سچائی کی تاب نہ لا کر اس دنیا سے ہی کوچ کر جائے۔

دوستو! یہ خاکسار عربی' فارسی' انگریزی اور اردو کے بہت بڑے عالم پرویز کو اپنا محسن کیوں نہ قرار دے کہ ہمیں موت کی وادی سے بچانے والا یہ واحد بندہ ہے۔ بات جسمانی موت کی نہیں' مسئلہ ذہنی موت کا ہے۔ ہمیں پرویز نے ذہنی موت سے بچایا ہے۔ خوش قسمت ہے وہ انسان جو ذہنی موت سے قبل جسمانی طور پر مر جائے اور بدقسمت ہے وہ انسان جو ذہنی موت کے بعد جسمانی سطح پر زندہ رہے۔ کوئی اس عذاب کو کیا سمجھ سکتا ہے۔

دفتری زندگی کے دوران ایک مرتبہ نہیں ان گنت مرتبہ ایسا ہوا کہ زندگی بغیر کسی آراستگی کے' بغیر کسی ورق کے' ہر Drapery سے مکمل بے نیاز سامنے آتی رہی۔ ایسے لمحے بار بار آئے کہ غیبی قوتوں کی اشد ضرورت محسوس ہوئی' لیکن یہ کیا کہ Stretch the Truth والا فارمولا بلکہ مجرب نسخہ بھی آزما کر دیکھ لیا' پر ہوا کچھ نہیں' جو زمینی حقائق تھے' وہ جوں کے توں رہے' جو سچ تھا' وہ وہی رہا۔ اسباب کا جادو ہی سر چڑھ کے بولا' علت اور معلول کے بیچ رشتے کی توانائی اس شدت سے ابھر کر سامنے آئی کہ I was Stumped.

طاقچے کے خطوط پڑھتے پڑھاتے عمر بیت گئی تھی' کچھ پلے نہیں پڑا تھا' یہ پرویز ہی تھا جس نے اقبال کے یہ شعر یوں سمجھائے کہ ہمیں ''کلیات اقبال'' میں انہیں اس نیت سے تلاش کرنا پڑا' کہیں یہ اشعار پرویز نے خود گھڑ کر تو اقبال سے منسوب نہیں کر دیئے' آپ بھی سنئے:

تری دعا سے قضا تو بدل نہیں سکتی
مگر ہے اس سے یہ ممکن کہ تو بدل جائے
تری دعا ہے کہ ہو تیری آرزو پوری
مری دعا ہے تری آرزو بدل جائے

جی ہاں صاحبو! یہ پرویز صاحب کی ''کتاب التقدیر'' تھی جس کے بالاستعیاب مطالعہ نے وہ گرہ کھول دی جو ذہن میں بیس برس سے پڑی ہوئی تھی' کس کس نکتہ ور کی بارگاہ میں ناصیہ فرسائی نہیں کی تھی ہر کہیں سے ایک سا ہی جواب موصول ہوا تھا۔ ''نہ کہیں جہاں میں اماں ملی' جو اماں ملی تو کہاں ملی''۔ اس معرکہ آرا کتاب کے مطالعہ کے بعد سب سے پہلے تو اپنے اللہ سے ہاتھ باندھ کر معافی مانگی کہ یارب الارباب! اس عاصی کو معاف کر دے کہ اب تک اپنا ہر جرم تیرے کھاتے میں ڈالتا آیا ہوں۔ تیرے قادر ہونے کا مفہوم اصفیاء وعلماء نے مجھے یہی سمجھایا تھا کہ گناہ کی توفیق بھی تو دیتا ہے' نیکی کی سعادت بھی تو ہی بخشتا ہے۔ گمراہ بھی تو کرتا ہے' ہدایت کے جادے پر بھی تو ہی گامزن کرتا ہے۔ بندہ مجبور ہے' تیرے ہاتھوں میں کٹھ پتلی ہے' مختاری کی تہمت سے مہتم.....لیکن یہ پرویز تھا جس نے قرآن کھول کر دکھایا کہ نہیں نہیں یہ پاک خدا پر الزام ہے' اس نے تو ہر انسان کو مکمل اختیار دیا ہوا ہے اور پھر اس نے وہ آیات ایک ایک کر کے سمجھائیں جن میں تضاد محسوس ہوتا تھا' جو خدا کو غیر عادل ثابت کرتی تھیں' بے انصاف بتاتی تھیں۔ بندے کو مجبور صورت میں پیش کرتی تھیں۔ جب سارے عقدے کھل گئے تو زبان اپنے آپ یہ تلاوت کرنے لگی: ؎

نہ یہ تقدیر کا لکھا تھا نہ منشائے خدا
حادثے مجھ پہ جو گزرے مرے حالات میں تھے

ضمناً پرویز صاحب نے ہی وضاحت کی' قرآن مجید کی کوئی آیت تو دور کی بات ہے' ایک نقطہ' شعشہ تک بھی منسوخ نہیں۔ ورنہ بڑے بڑے زہاد پانچ سات آیتوں کے سامنے دم بخود یہ اقرار کرتے پائے گئے: اے آیتو! تم پر تو عمل نہیں ہو سکتا۔

سبحان اللہ یہ کریڈٹ اس پرویز کے کھاتے میں ہی لکھا جائے گا جسے سارے علماء صبح وشام کافر کافر کہتے نہیں تھکتے۔ آپ یقین کیجئے مسئلہ تقدیر سمجھ میں آنے کے بعد اس عاجز کو وہی لذت محسوس ہوئی جو پوری تحقیق کے بعد کسی نومسلم کو قبول اسلام کی ملکوتی ساعت میں محسوس ہوتی ہوگی۔

غلام احمد پرویز کا دوسرا بڑا احسان یہ ہے کہ انہوں نے ختم نبوت کا حقیقی مفہوم سمجھایا تفصیل پھر کبھی سہی' اجمالاً اتنا عرض ہے کہ احمدیوں کے ساتھ ہمارا بڑا وقت گزرا ہے۔ ہم نے ان لوگوں کو مجموعی طور پر اچھے کردار والے انسان پایا ہے' شرافت اور علم تقریباً ہر احمدی کے امتیازی اوصاف ہیں کہ ان کی جماعت منظم ہے' تربیتی نظام مثالی ہے لیکن ان لوگوں کے اعتقادات ریت کی دیوار ہیں۔ ہمیں حیرت ہوتی ہے کہ اس قدر اعلیٰ تعلیم یافتہ اصحاب کیوں معروضی بنیادوں پر اپنا جائزہ نہیں لیتے؟ ہم اپنے

طور پر اس کی دو وجوہ تلاش کر سکے ہیں۔ پہلی یہ کہ ہمارے علماء نے اس جماعت کے خلاف نفرت کی ایسی فضا تیار کی ہے کہ یہ لوگ اپنے کمزور عقیدوں کے ساتھ اور زیادہ مضبوطی سے جڑ گئے ہیں۔ اگر انہیں پیار کے ساتھ بات سمجھانے کی کوشش کی جاتی تو آج نتائج یکسر مختلف ہوتے۔ دوسری بات بھی خاص اہمیت کی حامل ہے کہ ختم نبوت کے باب میں عام مسلمانوں کا قریب قریب وہی موقف ہے جو خود قادیانیوں کا ہے۔ جی ہاں ایک آنے والے کا عقیدہ مسلمانوں کی میراث ہے۔ ''ہم نے احمدی علماء VS علمائے اسلام'' کافی مناظرے سنے ہیں۔ ہمیشہ یہی دیکھا کہ عام سے احمدی نے بھی اچھے بھلے عالم دین کو وہ عبارات دکھا کر لاجواب کر دیا جن میں غیر تشریعی نبوت کے اجرا کو ہمارے اکابرین نے تسلیم کیا ہے۔ اب یہ اکابرین عامی شامی نہیں' جید ہستیاں ہیں۔ اس نازک صورتحال میں علماء کرام اسی معروف تاویل کا سہارا لیتے ہیں کہ غیر تشریعی نبی سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت ہے وہ چونکہ آسمانوں پر زندہ موجود ہیں' آخری زمانے میں اسلام کی نشاۃِ ثانیہ (Renaissance) کے لئے تشریف لائیں گے۔ اس پر ذہین احمدی فوراً یوں گرفت کرتے ہیں۔ جناب! اصل چیز پھر ''ضرورت نبوت'' ہوئی۔ اگر تجدید و احیائے دین کے لئے پرانا نبی آ سکتا ہے تو نیا کیوں نہیں؟ اور پھر وہ نیا جو قرآن کو منسوخ کرنے والا نہ ہو' حضور ﷺ کا امتی ہو۔ نیز ختم نبوت کے پھر معانی یہی ہوئے کہ حضور ﷺ فضیلت کے اعتبار سے سب سے بلند درجہ نبی ہیں' آپ ﷺ کے بعد آپ ﷺ کی پیروی میں کوئی نبی مبعوث ہو جائے تو آپ ﷺ کی ختمیت مرتبی متاثر نہیں ہوتی جیسا کہ حضرت عیسیٰؑ کی آمد ثانی کے بعد متاثر نہیں ہوگی کیونکہ وہ اللہ کے نبی ہوں گے اور مسلم شریف کی احادیث کے مطابق ان پر وحی بھی اترے گی۔

دوستو! یہ جری شخص غلام احمد پرویز تھا جس نے قرآن کی رو سے توضیح کی' ختم نبوت کا مطلب ہے' حضور ﷺ ہر لحاظ سے آخری نبی ہیں۔ اب ان کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا' پرانا نہ نیا۔ قرآن بار بار شہادت دیتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ علیہ السلام بھی اسی طرح وفات پا چکے ہیں جس طرح تمام انبیاء کرام رحلت فرما گئے ہیں۔ چنانچہ اب کسی کی آمد کا سرے سے کوئی سوال ہی نہیں کیونکہ ختم نبوت کا مطلب ''ضرورتِ نبوت'' کا خاتمہ ہے۔ اب ہدایت کا سرچشمہ صرف اور صرف قرآن ہے' کوئی نئی وحی نہیں' حتیٰ کہ کسی مترادف نام و متبادل عنوان سے بھی اللہ کا کلام کسی بندے پر نازل نہیں ہوگا' کیونکہ اللہ کا کلام حجت ہوتا ہے' اب قرآن کے بعد جو اس حجت کو بیچ میں لائے گا' وہ امت کو نئی تقسیم سے دوچار کرے گا۔

ویسے جملہ معترضہ کے طور پر ذرا غور کیجئے کہ احمدیوں کا مسئلہ سلجھانا کتنا آسان تھا یہ لوگ وفات مسیح کے پہلے ہی قائل ہیں۔ انہیں صرف خاتم النبین کا مفہوم سمجھانے کی ضرورت تھی۔ انہیں بتایا جاتا کہ آیات روایات پر مقدم ہیں۔ جب آیات یہ اصولی فیصلہ دے رہی ہیں کہ نئی نبوت ممکن ہی نہیں تو آپ اس فیصلے کے آگے سر تسلیم خم کر دیں' کسی اور طرف آپ کو دیکھنے کی ضرورت ہی نہیں۔ واضح سی بات ہے کہ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ قول رسول ﷺ اور آیت ربانی میں تناقض ہو۔ جب اللہ کی کتاب کہہ رہی ہے حضور ﷺ آخری نبی ہیں اور حضرت عیسیٰؑ وفات پا چکے ہیں تو پھر حضور ﷺ کا نقطہ نظر اس سے ہٹ کر کیسے ہو سکتا ہے؟ نتیجہ معلوم! دیکھنے والی چیز یہ ہے کہ از سر نو جائزہ لیا جائے وہ فرامین جو حضور ﷺ سے منسوب کئے جا رہے ہیں کیا وہ حضور

ﷺ کے ارشادات ہیں بھی یا نہیں؟ پرویز صاحب نے ہی قوم کو سمجھایا کہ حدیث رسول ﷺ رہنمائی کا بلاشبہ سرچشمہ ہے لیکن یہ طے ہونا ازبس ناگزیر ہے کہ جسے حدیث رسول ﷺ کہا جارہا ہے وہ حدیث رسول ﷺ ہے بھی یا نہیں؟ اور ساتھ ہی انہوں نے بہترین معیار بھی مقرر کردیا ہے کہ جو قول قرآن کے مطابق ہے وہ قول رسول ﷺ ہے جو اس کے برعکس ہے وہ قول رسول ﷺ ہو ہی نہیں سکتا۔ اس تناظر میں پرویز کو منکر حدیث کہنا سراسر ناانصافی ہے یا نہیں؟

غلام احمد پرویز کی علمی خدمات کا مختصر جائزہ بھی کئی جلدوں کی کتاب میں لیا جاسکتا ہے۔ وقت آئے گا ان پر بڑی بڑی یونیورسٹیاں تحقیقی مقالے لکھوائیں گی، تب امت مسلمہ کو معلوم ہوگا کہ کتنا بڑا شخص ان میں ہوگزرا ہے۔ ایسا شخص جس نے مدت العمر قرآن اور صاحبِ قرآن ﷺ سے ایسا عدیم النظیر عشق کیا کہ واقعتاً دور دور تک مثال دکھائی نہیں دیتی۔ پچاس سے زائد تصانیف چھوڑ کر جانے والے پرویز نے کہیں نہیں کہا کہ میرا کہا حرفِ آخر ہے۔ انہوں نے عمر بھر عجز و انکسار کی ردا اوڑھے رکھی اور یہی کہتے رہے کہ میں قرآن کا معمولی طالب علم ہوں، جس طرح مجھے سمجھ آئی، خلوصِ نیت سے اسی طرح آگے سمجھانے کی کوشش کرتا رہا ہوں۔ یہی بنیادی وجہ ہے کہ اتنا اہم علمی خزینہ تخلیق کرنے والے پرویز نے کسی فرقے کی بنا نہیں رکھی۔ ان کی جماعت وہی تھی جو رسول کریم ﷺ کی جماعت تھی۔ ظاہر ہے اللہ کے نبی نے اپنی امت کو فرقوں میں بانٹنا تو درکنار دیکھنا بھی پسند نہیں کیا، اسی لئے پرویز صاحب نے بھی علامہ اقبال کی طرح بس ایک فکر دی ہے، اب اس نابغہ عصر کی فکر سے پوری کی پوری امت کتنا نور کشید کرتی ہے، یہ اس پر منحصر ہے۔ انہوں نے شروع سے لے کر آخر تک قرآن مجید کی شرح اپنی ضخیم تصانیف میں محفوظ کردی ہے۔ جو ایک مربوط نظام فکر سے بجا طور پر معنون کی جاسکتی ہے۔ اب یہ ہمارا کام ہے کہ روشنی کے اس مینار سے استفادہ کرتے ہوئے اس قرآنی معاشرے کی تشکیل کریں جس میں مسرتیں ہوں، بدعنوانیاں نہ ہوں، محبتیں ہوں، خوشحالیاں ہوں، انسانی ذوات نشوونما پائیں، امن ہو، فساد نہ ہو، افلاس کا عذاب نہ ہو۔ سب اپنے سوہنے اللہ کے قوانین کی اطاعت کریں اور اس کے آخری نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے اتنا ہی پیار کریں جتنا ان کی خوبصورت ذات سے ان کے دوستوں حضرت ابوبکرؓ۔ حضرت عمر فاروقؓ۔ حضرت عثمان غنیؓ۔ حضرت علی مرتضیٰؓ اور دیگر مخلص احباب رضی اللہ تعالیٰ عنھم کو تھا۔

☆.....☆.....☆

ابوانیس فاروقی، کینیڈا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

برقی توانائی کا بحران یا منصوبہ بندی کا فقدان

2008ء میں ملک عزیز کے ایک ماہانہ مؤقر جریدے میں اپنے ایک مطبوعہ مضمون بعنوان ''جاگیرداری وسرمایہ داری کی موت وفنا میں ملک عزیز پاکستان کی حیات و بقا'' میں تفصیل سے عرض کیا تھا کہ اس ملک کے مسائل اس وقت تک حل طلب رہیں گے جب تک یہاں جاگیرداری وسرمایہ داری کا عفریت پروان چڑھتا رہے گا۔ تقسیم ہند کے ساتھ ہی اگر زرعی زمینوں کی ایک خاص تناسب سے عادلانہ تقسیم ہوجاتی اور محنت کش کاشتکاروں کے حوالے کردی جاتیں تو کافی حد تک مشکلات پر قابو پایا جاسکتا تھا۔ یہ زمینیں وڈیروں، نوابوں اور خانوں کو انگریز نے کاسہ لیسی اور چاپلوسی کے عوض اس شرط پر عطا کی تھیں کہ وہ اپنے اپنے زیر اثر مفلوک، مجبور اور مقہور لوگوں کو زیر مزارعت وملازمت رکھیں اور محض نانِ جویں پر زندہ رکھ کر استعمار کی غلامی پر آمادہ رکھیں۔ گوروں نے اپنے دور میں ہند کے لوگوں کو ہر ہر انداز میں غلامی کے شکنجے میں کسے رکھا مگر جزائر برطانیہ کی حدود میں اپنے عوام کو جمہوری روح (اگرچہ وہاں بھی ملوکانہ جمہوریت تھی) کے مطابق آسودہ رکھا۔ جاتے جاتے ہند کی تقسیم کے بعد خصوصاً پاکستانی عوام کو اپنی معنوی ذریت کے حوالے کر گیا۔ یہی وجہ ہے یہ بے چارے آج تک اپنے تن سے غلامی کا چولا اتار سکے نہ اس خو سے چھٹکارا پا سکے نتیجہ پاکستان ''مسائلستان'' بن گیا۔ اگر ملک عزیز کے قائداعظم علیہ الرحمہ زندہ رہتے تو شاید بلکہ یقیناً کوئی مؤثر لائحہ عمل دے جاتے۔ شومئ قسمت وہ اور ان کے وفا کیش ساتھی ہم سے جلد ہی رخصت ہوگئے ان کے بعد تو یہ قوم ایک لحاظ سے لاوارث ہوگئی اور مسلسل دلدل میں دھنستی چلی گئی پھر

منزل انہیں ملی جو شریک سفر نہ تھے

پیچ در پیچ مسائل ومصائب میں الجھے پاکستان اور اس کے بے حال عوام کے ان دنوں سب سے بڑے مسائل روز افزوں مہنگائی اور توانائی (بجلی) کا بحران ہے۔ پیدا شدہ مسائل ایک دوسرے کے ساتھ اس قدر پیوستہ اور جڑے ہوئے ہیں کہ ایک کی وجہ سے دوسرا مسئلہ پیدا ہوتا چلا جارہا ہے یوں سمجھیں مسائل کی ڈور ایسے الجھی ہے کہ اس کے سلجھاؤ کے لئے ڈھونڈو تو سرا نہیں ملتا۔ قرآن مجید کے الفاظ میں یہ سب کچھ اپنے کئے دھرے کا نتیجہ ہے۔ بِمَا كَانُوا يَصْنَعُونَ (النحل:112)۔ جس کی وضاحت ان لفظوں میں ہوئی۔

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ (الروم:41)۔

خشکی اور تری میں لوگوں کے (اپنے) اعمال (کرتوتوں) کے باعث فساد (ہی فساد) برپا ہوگیا۔

ملک عزیز اپنے جغرافیائی محل وقوع کے اعتبار سے خط استواء کے اس مقام پر واقع ہے جہاں کوہ و دَمَن اور صحراؤں و دریاؤں کی فراوانی ہے۔ اس پر مستزاد فصول اربعہ کی بے پایاں عنایت ربانی ہے۔ جس ملک کو ایسی فطری خصوصیات (Features) عطا ہوں وہاں کے عوام افلاس زدہ اور مفلوک الحال ہو کر رہ جائیں کیسے باور کر لیا جائے! جب سے یہ معرض وجود میں آیا ہے تب سے ایسے غاصبوں کا تسلط رہا ہے جو استعماروں کا آلہ کار رہے ہیں اور نسل در نسل وہی لوگ گذشتہ باسٹھ سالوں سے سیاہ وسفید کے مالک چلے آ رہے ہیں۔ خاندانی وموروثی سیاست کی بدولت ایک ہی مزاج ومعیار کے افراد اس ملک اور عوام کو بار بار دیکھنے اور آزمانے کو ملتے ہیں جن میں ''قومی سوچ'' کا فقدان ہے ایسے فکری اپاہجوں سے اچھائی کی توقع آخر کیونکر ممکن ہے۔ انفرادی مفادات کی ''ہوشربا ہوس'' نے سیاسی جماعتوں اور ان کے زعماء کو اجتماعی مفادات ومقاصد کے لئے کبھی آمادہ ہونے ہی نہیں دیا۔

اس ملک میں اس قدر متبادل اور گوناگوں وسائل ہیں جنہیں استعمال میں لا کر ہم برقی توانائی میں نہ صرف خود کفیل ہو سکتے ہیں بلکہ قرب وجوار میں ضرورت مندوں کو بھی توانائی مہیا کر سکتے ہیں۔ دنیا میں پاکستان ایسے جغرافیائی محل وقوع رکھنے والے ہر ملک کے پاس بجلی پیدا کرنے کے متنوع ذرائع ہیں: آبی وسائل' یک سمتی ساحلی ہوائیں' وافر آفتابی تمازت و حرارت' معدنی ذخائر اور جوہری توانائی وغیرہ ان تمام وسائل سے ہمارا ملک مالا مال ہے۔

شمالی علاقوں میں پہاڑوں کا ایک طویل سلسلہ ہے جہاں جنگلات کی کثرت کے باعث جنوبی علاقوں میں واقع سمندروں کی سطح سے اٹھنے والے پانی بھرے بادل تیز ہواؤں کے ذریعے یہاں پہنچ کر خوب برستے ہیں۔ وَاَرْسَلْنَا الرِّيٰحَ لَوَاقِحَ فَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَسْقَيْنٰكُمُوْهُ ۚ (الحجر:22)۔ معاً یہاں اکثر بالائی سطح پر جب درجہ حرارت نقطہ انجماد پر پہنچتا ہے تو برفباری کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ وَيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ جِبَالٍ فِيْهَا مِنْۢ بَرَدٍ (النور:43)۔ پہاڑ برف پوش ہو جاتے ہیں اس طرح یہاں اس شکل میں بے پناہ پانی ذخیرہ ہو جاتا ہے جو ہزار بلکہ لاکھ انسانی کاوشوں سے ممکن نہیں۔ وَمَآ اَنْتُمْ لَهٗ بِخٰزِنِيْنَ (الحجر:22)۔ جو بعد ازاں ایک خاص درجہ حرارت پر پگھل کر چھوٹے چھوٹے ندی نالوں (Catchment areas) کے ذریعے ایک مقام پر اکٹھا ہو جاتا ہے اور دریا کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ فَسَالَتْ اَوْدِيَةٌۢ بِقَدَرِهَا (الرعد:17)۔ اب چاہے اس سے فائدہ اٹھائے بغیر سمندروں میں دوبارہ بھیج دیا جائے یا انہیں ذخیرہ کر کے ایک خاص سطح تک (ہیڈ ورکس کے ذریعے) بلند کرنے کے بعد ٹربائینیں (Turbines) چلا کر بجلی پیدا کر لی جائے۔ ماضی میں چند ایک بڑے ہیڈ ورکس تعمیر کر کے ہم نے پن بجلی پیدا کی ان میں اکثر منصوبے ایوبی دور میں مکمل ہوئے جو اپنی مدت پوری کر چکے اس کے ساتھ ہی مزید ڈیم (Dams) بنانے کی ضرورت تھی جن میں کالا باغ ڈیم بھی شامل تھا جو اپنے فطری ماحول اور محل وقوع کے حوالے سے انتہائی محفوظ' کم خرچ اور ملکی ضروریات پورا کرنے کی کامل استعداد کے قابل تھا مگر ابھی تک سیاست کاروں کی آویزش کا شکار یہ منصوبہ تشنۂ تعمیر ہے۔ ایسا ممکن نہ تھا تو بڑے بڑے ڈیموں کی تعمیر کے بجائے اگر ہم نے

گذشتہ باسٹھ سالوں میں چھوٹے چھوٹے منصوبوں پر مسلسل کام جاری رکھا ہوتا تو مقامی ضرورتوں کو پورا کر کے موجودہ ناگفتہ بہ صورتحال سے یقیناً بچا جا سکتا تھا بالخصوص بڑی بڑی نہروں پر پانی کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ زیریں علاقوں تک چھوٹے چھوٹے ہیڈ ورکس تعمیر کر کے مقامی ضروریات پورا کرنے کے لئے بجلی پیدا کی جا سکتی تھی۔

بلوچستان میں اپنے قیام کے دوران میں نے دیکھا کہ اکثر مقامات پر دو پہاڑوں کے درمیان کم فاصلہ ہونے کی بنیاد پر بند (ہیڈ ورکس) تعمیر کئے جا سکتے ہیں ان پہاڑوں کے عقب میں بے پناہ جگہ اور مناسب ڈھلوان ہونے کی وجہ سے کافی مقدار میں پانی ذخیرہ کر کے چھوٹے چھوٹے پن بجلی گھر تعمیر کرنا آسان ہے۔ بالائی علاقوں سے زیریں مقامات پر پہنچ کر پانی جب رود کوہیوں سے گذرتا ہے تو اس قدر اس کا دباؤ ہوتا ہے کہ اکثر اوقات سواریوں سے بھری گاڑیوں یا سامان سے لدے ٹرکوں کا اسے عبور کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان علاقوں میں پانی کے نشیب کی طرف بہاؤ میں فطرتاً شدید دباؤ ہوتا ہے جو چھوٹے جنریٹر چلانے کے لئے خاطر خواہ فائدہ مند ہے۔ پانی کی ان قدرتی گذرگاہوں پر دیواریں (Brakers) کھڑی کر کے نشیب میں دور تک پن بجلی کے چھوٹے یونٹ لگا کر اس علاقے کے مکینوں کو بجلی مہیا کی جا سکتی ہے اور زراعت کے لئے پانی استعمال میں لایا جا سکتا ہے۔ تاہم یہ جزو وقتی منصوبے ہو سکتے ہیں جن کا انحصار محض بارشوں پر ہے۔ 2001ء میں اس وقت کے ایک مینگل گورنر نے ایک دو مقامات پر اس قسم کے چھوٹے ڈیموں کا افتتاح کیا تھا مگر صرف پانی ذخیرہ کرنے کے لئے۔ جب کہ شاید ابھی تک بجلی کی جنریشن کے لئے کوئی کام نہیں ہوا۔

فورٹ منرو کے پہاڑوں سے اترتے ہی رَکھنی سے آگے پہاڑوں کا ایک ایسا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے جن کے درمیان گذرگاہیں یا شاہراہیں بظاہر یکساں سطح کی لگتی ہیں مگر کسی بالا مقام سے نظارہ کیا جائے تو ان میں خاصا ڈھلوان ہے جہاں پانی ذخیرہ کر کے دوہرا فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے ایک تو جب پہاڑوں سے پانی دامن میں آتا ہے تو پیداواری صلاحیت کی حامل زرخیز مٹی ساتھ لاتا ہے جس کے قدرتی اجزاء کسی قسم کی کھاد یا فرٹیلائزر سے قطعاً بے نیاز ہوتے ہیں۔ دوسرے اسی پانی کو ذخیرہ کر کے بجلی پیدا کر کے مقامی ضروریات کو پورا کیا جا سکتا ہے۔

بھارت سے دریائی پانی کی تقسیم پر ہم نے ہر سطح پر خوب دہائی دی مگر اپنے آبی وسائل کو محفوظ کرنے میں مجرمانہ غفلت سے کام لیتے رہے۔ حال ہی میں ہماری منتظمہ کی حکمت عملی کا بھرم اس وقت کھل گیا جب ہنزہ میں عطاء آباد کے مقام پر ایک ہنگامی اور پرفتن جھیل وجود میں آ گئی جس سے بے تحاشا عوامی و ریاستی نقصان ہوا پانی کے اتنے بڑے ذخیرے کو ضبط و محفوظ کرنے میں ہم جس کسمپرسی کا شکار رہے وہ سب کے سامنے ہے۔ نیتوں میں فتور نہ ہو تو اعلیٰ انتظامی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے قدرت کے عطا کردہ شاندار وسائل سے بھرپور استفادہ ممکن ہے۔

ساحل سمندر سے چلنے والی ہوائیں عموماً یک سمتی ہوتی ہیں مثلاً جن لوگوں نے کراچی سے حیدر آباد اور آگے اندرون سندھ تک سفر کیا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ یہ ہوائیں یک سمتی ہونے کے ساتھ اس قدر تیز ہوتی ہیں کہ ہاتھ سے نکلتا

رومال یا کوئی چیز آسانی سے قابو نہیں آتی۔ حیدرآباد اور آس پاس کے علاقوں میں لوگوں نے مدتوں سے اپنے گھروں کی تعمیر بھی اس انداز میں کر رکھی ہے کہ آسانی سے ان کے گھروں میں ان ہواؤں کا گذر ہو سکے۔ خاص طور پر گھروں کی بالائی چھت سے لے کر زیریں کمرے تک ایسے چمنی نما روشندان (بطور ایئر کنڈیشنر) بنا رکھے ہیں کہ تازہ ہوا ان سے گذر کر آخر تک پہنچ جائے اور ضرورت کے مطابق جس کمرے میں ضرورت ہو تو اس خول دار ستون سے مطلوبہ کمرے میں سوراخ کھول لیا جائے۔ کراچی اور حیدرآباد کے درمیان اس قدر وسیع علاقہ خالی پڑا ہے جہاں ان یک سمتی ساحلی ہواؤں سے پَون چکیاں (Wind Mills) چلا دی جائیں تو پورا ملک نہ سہی ان علاقوں میں جہاں ان ہواؤں کا گذر ہے جنریٹر چلا کر وہاں کے باسیوں کو وسیع پیمانے پر ارزاں بجلی مہیا کی جا سکتی ہے۔ ہمارے زیادہ تر سمندری ساحل سندھ اور بلوچستان میں واقع ہیں۔ ان ہواؤں کی رسائی (Approach) ساحلوں سے بہت دور آبادیوں تک ہے۔ ایک جائزے کے مطابق پاکستان میں پَون چکیوں سے پچاس ہزار میگاواٹ بجلی پیدا کی جا سکتی ہے مگر اس وقت صرف سو میگاواٹ بجلی پیدا کی جا رہی ہے۔ چین میں پون چکیوں سے 2500 جب کہ بھارت میں 1800 میگاواٹ بجلی پیدا کی جا رہی ہے۔

پنجاب، سندھ اور بلوچستان کا کافی علاقہ طلوع آفتاب کے بعد دھیرے دھیرے سورج کے سامنے آجاتا ہے اور کافی دیر تک تمازت یا حرارت برقرار رہتی ہے۔ اگر بڑے پیمانے پر کوئی منصوبہ قابل عمل نہ ہو تو شمسی توانائی کے استعمال سے برقی توانائی کا حصول چھوٹے یونٹوں کے ذریعے ممکن بنایا جا سکتا ہے۔ یہ چھوٹے یونٹ گھریلو استعمال کے لئے آسان اقساط پر مذکورہ علاقوں کے مکینوں کو مہیا کئے جائیں تو آبی وسائل سے حاصل ہونے والی برقی توانائی کو مشکل حالات میں محفوظ کیا جا سکتا ہے تاکہ بوقت ضرورت صنعت و زراعت کے لئے استعمال میں لائی جا سکے۔ اس طرح عوامی بے چینی کے ساتھ حکومتی اضطراب بھی کم ہو سکتا ہے۔ جب سے ملک عزیز معرض وجود میں آیا ہے شمسی توانائی کے استعمال کے لئے کسی بڑے منصوبے پر ہنوز عمل درآمد نہیں ہو سکا۔ البتہ ملک کے مختلف شہروں میں اِکا دُکا چھوٹے یونٹ کام کرتے دکھائی دیتے ہیں بعض کاشتکاروں نے اپنے وسائل استعمال میں لا کر اپنی مدد آپ کے تحت زراعت کے لئے شمسی توانائی کے ذریعے ضرورت کے وقت ٹیوب ویل چلا رکھے ہیں۔ انفرادی سطح پر اگرچہ ایسے یونٹ مہنگے پڑتے ہیں مگر مشکل ترین حالات میں یہ نعمت سے کم نہیں کہ زرعی محنت کو اکارت جانے سے بچا جا سکتا ہے۔ حال ہی میں سولر واٹر پمپ کا اسلام آباد میں تجربہ ہوا ہے جسے عظیم پڑوسی ملک چین سے درآمد کیا گیا ہے اس سسٹم کے تحت چلنے والا پمپ کم از کم پچیس سال تک کارآمد ہے۔

اسی طرح بلوچستان میں اکثر اور سندھ میں بعض مقامات پر کوئلے کے وسیع ذخائر موجود ہیں۔ تھر کول کے بارے میں ہمارے ملک کے ایک معروف سائنسدان نے حال ہی میں انتہائی اہم انکشاف کیا ہے کہ جدید بنیادوں پر کوئلے (کول) کو استعمال کر کے جہاں ٹرانسپورٹ کے اخراجات بچائے جا سکتے ہیں۔ وہاں یہ ذخائر آئندہ آٹھ سو سال تک بجلی پیدا کرنے کے لئے کافی ہیں۔ مگر وائے افسوس دیگر کئی معدنی وسائل کی طرح اس اہم خزانے سے ابھی تک استفادہ نہیں ہو سکا۔ حالانکہ ان کو دریافت کئے سولہ سال سے زیادہ عرصہ ہو چکا ہے (جس کی مقدار 200 ارب ٹن بتائی جاتی ہے)۔ خلاق عالم کی اس بے پناہ

عطا کے باوجود بے حال عوام کسمپرسی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں جن کے ہاتھوں میں کشکول گداگری تھما دیا گیا ہے۔ جب قوم کے راہنما گداگری میں دی گئی وہ رقم جو بمع سود قابل واپسی ہے' پر باچھیں کھلا کر حمیت نا آشنا کامیابی پر اتراتے پھریں وہ بھلا قوم کے اجتماعی مفاد اور آئندہ نسل کی بقاء کا کیا سوچ سکتے ہیں ہر لحاظ سے ''ڈنگ ٹپاؤ'' کام کر کے اپنی تجوریاں بھرنے میں مصروف ہیں۔ بعض قومی درد اور اجتماعی سوچ کے حامل افراد نے ''جوہری توانائی'' کے حصول میں شبانہ روز کاوشیں کی ہیں اس سے بھی ہم نے حسب حال فائدہ نہیں اٹھایا ''ایٹمی طاقت'' کا دعویٰ رکھنے کے باوجود ہم اپنا بھرم نہ رکھ سکے۔ پورا ملک تاریکیوں میں ڈوب چکا ہے۔ دیا جلانے کے لئے مٹی کا تیل بھی بجلی کے یونٹ سے زیادہ مہنگا کر دیا گیا ہے۔ صرف رینٹل پاور پلانٹس کی (ذاتی مفادات کے تحت) پذیرائی کے لئے ملک وقوم کو اس جانکاہ صورت حال میں قصداً دھکیل دیا گیا ہے ورنہ ملک عزیز پاکستان میں برقی توانائی کے حصول کے لئے قدرت کے انمول اور وافر وسائل کی کمی نہیں۔ ان وسائل سے فائدہ اٹھاتے ہوئے چھوٹے منصوبوں پر فوری عملدرآمد کر کے قوم کو اندھیروں سے نکالا جا سکتا ہے۔

اس وقت ترقی یافتہ ممالک بالخصوص جاپان اور چین کی مثال ہمارے سامنے موجود ہے۔ اول الذکر کے یہاں معدنی وسائل نہ ہونے کے برابر ہیں اس سے بڑھ کر انیسویں صدی کے وسط تک جاگیردار سفاکوں کے چنگل میں رہا پھر ناگاساکی اور ہیروشما کا ہولناک حادثہ اس پر سوا ان تمام محرومیوں اور بربادیوں کے باوجود اس قوم نے عزم بالجزم کے ساتھ انقلاب کی جب ٹھان لی تو ہر ممکن طریقے سے وسائل خرید کر اپنے ملک کو صنعتی انقلاب کی اس سطح پر لا کھڑا کیا جو نہ صرف لائق تعریف بلکہ قابل رشک اور تقلید بھی ہے۔ اس انقلاب کے آغاز ہی میں یورپ کے مقابل اپنی مصنوعات کو دنیا میں متعارف کروا دیا۔ اسی طرح چین اپنے کوہساروں اور میدانوں میں چھوٹے چھوٹے بجلی گھر تعمیر کر کے مقامی آبادیوں کو آسودہ کرنے کے بعد قومی سطح پر صنعتی ضروریات کے لئے برقی توانائی بلا قیمت مہیا کر رہا ہے۔ کوئی ہے اس میدان میں اس کے مقابل!!! محفوظ اثاثوں کے حوالے سے دنیا کے پہلے تین ممالک میں شامل ہو چکا ہے اور دنیا کی عالمی طاقت اسی کی مقروض ہے۔ کل جو اسے ایک آنکھ نہ بھاتا تھا آج مالی استمداد کے لئے اس کے آگے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہے۔ جی ہاں۔ یہ وہی چین ہے جو ہم سے ایک سال بعد آزادی کی نعمت سے بہرہ ور ہوا۔ نشہ بازوں کی آماجگاہ تھا۔ غربت وافلاس کی اس سطح پر تھا کہ روٹی کے چند نوالوں کے لئے ڈیڑھ لاکھ چینیوں کو بطور قلی کیوبا بھیجنا پڑا اور لگ بھگ اتنی ہی بڑی تعداد کو 1860ء میں پیرو (Paro) کے اندر غلامی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہونا پڑا اور آج وہی چین ایک عظیم الشان طاقت کے طور پر خریطہ عالم پر اس شان سے ابھرا ہے کہ جس کی نظیر شاید و باید دنیا کی کون سی منڈی ہے جہاں "Made in China" کے جلی عنوان سے اس کی مصنوعات ومنتوجات موجود نہ ہوں۔ چھا گیا ہے صرف اس لئے کہ ''قومی جذبے'' کے ساتھ میدان عمل میں اترا اور اپنے بے عمل وبدکردار رجعت پسندوں سے خلاصی پا کر نئی نسل کو جدت یعنی جدید علوم وفنون پڑھنے اور سیکھنے کی راہ پر ڈال دیا جس نے چھوٹے بڑے منصوبوں پر اپنے وسائل سے عملدرآمد کر کے بڑی طاقتوں کو لرزہ براندام کر دیا ہے۔ بالخصوص شہنشاہ عالم امریکہ کو جس کے ہم من حیث القوم اپنی متوارث قیادت کے طفیل نسل در نسل غلام چلے آ رہے ہیں۔

ڈاکٹر انعام الحق، اسلام آباد

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

قرآن کے نظامِ عدل کے چند بنیادی اصول

قرآنی نظامِ عدل کے نفاذ میں رنگ، نسل، خون، زبان اور وطن کا اختلاف کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ اصل (Origin) کے اعتبار سے تمام انسان ایک امتِ واحدہ ہیں۔

وَمَا كَانَ النَّاسُ اِلَّآ اُمَّةً وَّاحِدَةً (10:19)

اور تمام فرزندانِ آدم کو یکساں واجب التکریم بنایا ہے۔

وَلَقَدۡ كَرَّمۡنَا بَنِیۡۤ اٰدَمَ (17:70)

''الناس'' میں اپنے اور پرائے، مومن و کافر سب شامل ہیں۔ قرآن کریم اس لئے خدا کا تصور بطور ''رب العالمین'' اس کے رسول کا تصور بطور ''رحمۃ للعالمین'' اور خود قرآن کا تصور ''ذکر للعالمین'' کا دیتا ہے۔

ان میں تقسیم دو گروپوں میں خود اللہ نے آئیڈیالوجی کی بنا پر کی ہے۔

هُوَ الَّذِیۡ خَلَقَكُمۡ فَمِنۡكُمۡ كَافِرٌ وَّمِنۡكُمۡ مُّؤۡمِنٌ ؕ (64:2)

اللہ وہ ہے جس نے تم سب کو پیدا کیا۔ سو تم میں بعض کافر ہو گئے اور بعض مومن۔

اسی سے دو قومی نظریہ کا وجود ہوا، جو نظریہ پاکستان کی بنیاد کہلایا۔

قرآن سے ہمیں واضح ہدایت ملتی ہے کہ اس نظامِ عدل کے نفاذ کے لئے ضروری ہے کہ خود اسلامی مملکت تمام افرادِ معاشرہ کو بنیادی ضروریاتِ زندگی مہیا کرنے کی پابند ہو۔

وَمَا مِنۡ دَآبَّةٍ فِی الۡاَرۡضِ اِلَّا عَلَی اللّٰهِ رِزۡقُهَا (11:6)

زمین میں کوئی چلنے والا ایسا نہیں جس کے رزق کی ذمہ داری اللہ پر نہ ہو۔

قرآن کا کہنا یہ ہے کہ جو مملکت قوانینِ خداوندی کے نفاذ کے لئے وجود میں آتی ہے، وہ ان تمام ذمہ داریوں کو اپنے اوپر لے لیتی ہے جنہیں خدا نے اپنی طرف منسوب کیا ہے۔ اسی ذمہ داری کے احساس نے امیر المومنین حضرت عمرؓ کی زبان سے ادا کرائے، تاریخ میں یہ الفاظ زبان زدِ عام ہیں کہ خدا کی قسم! اگر دجلہ کے کنارے ایک کتا بھی بھوکا پیاسا مر جائے تو قیامت کے دن عمر سے اس کی بھی باز پرس ہوگی۔ یہ مملکت تمام افراد کو اس کی ضمانت دیتی ہے کہ:

نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ ۚ (6:151)۔

ہم تمہیں بھی اور ان کو بھی رزق دیتے ہیں۔

رزق سے مراد ہیں وہ تمام اسباب و ذرائع جن سے انسانی جسم اور اس کی ذات کی نشوونما ہوتی جائے۔ ہوسکتا ہے کہ ہماری بات احباب کو اجنبی محسوس ہو اور شاید باعثِ اطمینان بھی نہ ہو۔ لہٰذا ضروری ہے کہ بتایا جائے کہ اس امر کی وضاحت ہمیں قرآن ہی سے حاصل ہوتی ہے۔

وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا ۚ وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۚ وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا ﴿۷۵﴾ (4:75)۔

تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم خدا کی راہ میں جنگ کے لئے نہیں اٹھتے۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ ستم رسیدہ، کمزور و ناتواں مرد، عورت، بچے کس طرح پکار پکار کر ہم سے فریاد کر رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہمیں اس بستی سے، جس کے رہنے والوں نے ظلم و ستم پر کمر باندھ رکھی ہے، کسی طرح نکال لے۔ اپنے ہاں سے ہمارے لئے کوئی سرپرست بھیج۔ کوئی مددگار ادھر پہنچا۔

اس آیت میں جنگ کی اجازت کی بات ہو رہی ہے جس کا اعلان کرنا صرف اسلامی مملکت کا فریضہ ہے۔ اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ مدینہ کی اسلامی مملکت کو مکہ میں رہ جانے والوں کی خدا سے فریاد کی پکار کے جواب میں ان کی مدد کے لئے اکسایا جا رہا ہے۔

یہاں دیکھنے کی بات ہے کہ مکہ کے مظلوم، خدا سے دعا کر رہے ہیں اور خدا اپنی اس مدد کرنے کی ذمہ داری بجالانے کے لئے مدینہ کی اسلامی مملکت سے کہہ رہا ہے، کیا تم سن نہیں رہے۔ وہ ہمیں پکار رہے ہیں، تم ان کی مدد کو کیوں نہیں پہنچتے۔ اسی سے بھی اخذ کیا جاتا ہے کہ خدا کی ذمہ داریاں، اس کے نام پر حکومت حاصل کرنے والی اسلامی مملکت پوری کرتی ہے۔

اسی آیت سے دعا کا یہ مفہوم بھی سامنے آتا ہے کہ خدا دعا کرنے والے کی مدد براہِ راست نہیں کرتا، بلکہ اسلامی حکومت کے ذریعے کرتا ہے، جو اسے اپنا فریضہ سمجھتے ہیں۔ کم از کم تاریخ میں امیر المومنین حضرت عمرؓ کا خطبہ تو اسی فریضہ کی غمازی کرتا ہے، جس میں انہوں نے فرمایا تھا کہ:

انی بینکم و بین اللہ۔ ویس بینی و بینہ احدا۔ وان اللہ قد الزمنی دفع الدعاء عنہ۔

لوگو! یاد رکھو۔ میں تمہارے اور اللہ کے درمیان ہوں لیکن میرے اور اس کے درمیان کوئی نہیں۔ اللہ نے مجھے اس بات کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے کہ میں تمہاری دعاؤں کو اس تک پہنچنے سے روک لوں۔

عزیزانِ گرامی دعا کا مقصد ہی اپنی ذات میں بہتری لانا ہے۔ اسی ضمن میں علامہ اقبالؒ نے اپنے مخصوص انداز میں

فرمایا ہے کہ:

تری دعا سے قضا تو بدل نہیں سکتی
مگر ہے اس سے یہ ممکن کہ تُو بدل جائے

انسان کی بنیادی ضروریات کی فراہمی کے ساتھ، قرآن مملکت کو انسان کو اس کے انفرادی ذوقِ حسن (Aesthetic Sense) سے محروم کرنے کی بھی ممانعت کرتا ہے۔

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ط (7:32)۔

ان سے کہو کہ وہ کون ہے، جو زیب و زینت کی ان چیزوں کو جنہیں خدا نے اپنے بندوں کے ذوق کی تسکین کے لئے بنایا ہے اور خوشگوار سامان زیست کو حرام قرار دے۔

قرآن کے نظام عدل کے نفاذ کے لئے ضروری ہے کہ معاشرہ میں ہر انسان، محض انسان ہونے کی حیثیت سے یکساں واجب الاحترام قرار پائے۔ کسی انسان کو دوسرے پر درجہ دے کر فوقیت دینے کا ایک اور صرف ایک ہی معیار قرآن نے رکھا ہے اور وہ یہ کہ درجہ اسے حاصل ہوگا جو اپنے اعمال کی بنا پر زیادہ تقویٰ شعار ہوگا۔

وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا ج (46:19)۔

ہر ایک کے مدارج ان کے اعمال (کاموں) کے مطابق مرتب ہوں گے۔

اور اس ضمن میں قرآن میں ہدایت ہے کہ:

اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ط (49:13)۔

تم میں سے اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ واجب التکریم وہ ہے، جو سب سے زیادہ تقویٰ شعار (قوانین کی نگہداشت کرنے والا) ہے۔

یاد رہے کہ قرآن جب سب لوگوں سے جمع کے صیغے میں مخاطب ہوتا ہے تو ان میں سب مرد اور عورتیں شامل ہوتی ہیں اور ان کو برابر کی سطح پر رکھا جاتا ہے۔ یہی عدل کی Demand ہے۔

نظامِ عدل کے تحت احترامِ آدمیت کا لازمی نتیجہ ہے کہ کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا غلام یا محکوم نہ رہے۔ ہر ایک کو یکساں طور پر آزادی حاصل ہو۔

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (3:79)

کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں کہ خدا اسے قوانین، حکومت اور نبوت عطا کرے اور وہ دوسرے لوگوں سے کہے کہ تم خدا سے ورے میرے غلام اور محکوم بن جاؤ۔

نظامِ عدل میں انسان کسی دوسرے انسان کا محکوم نہیں ہوسکتا۔ اس لئے کہا گیا کہ:

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ (12:40)

حاکم ہونے کا حق صرف خدا کو حاصل ہے۔

اس لئے کہ لا الٰہ الا اللہ کا عملی مفہوم ہی یہی ہے کہ خدا کے سوا کسی اور کو اقتدار اور اختیار نہیں کہ وہ کسی کو اپنا محکوم اور تابع فرماں (چہ جائیکہ غلام) بنا سکے۔ اس کی مزید وضاحت یوں ملتی ہے کہ:

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (5:44)۔

جو کتاب اللہ کے مطابق فیصلے نہیں کرتا (جو حکومت خدا کی کتاب کے مطابق قائم نہیں ہوتی) تو یہی لوگ کافر ہیں۔

قرآن نے عدل کے حتمی حکم کے ساتھ احسان کا بھی حکم دیا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ (16:90)۔

یہ حقیقت ہے کہ اللہ تمہیں عدل اور احسان دونوں کا حکم دیتا ہے۔

تمام انسانوں کو پیدائش کے اعتبار سے یکساں سمجھنا' ہر ایک کے لئے صلاحیتوں کی نشوونما کے لئے یکساں مواقع مہیا کرنا اور سعی و عمل کے لحاظ سے ان کے مقامات و مدارج متعین کرنا' محنت کے مطابق معاوضہ دینا' کسی کے حقوق و واجبات (Dues) کو سلب نہ کرنا اور تمام امور کے فیصلے اس قانون کے مطابق کرنا جو سب پر یکساں طور پر نافذ ہو' عدل کہلاتا ہے۔

لفظ احسان کا مادہ حسن (ح س ن) ہے' جس کے معنی ہوتے ہیں کسی کی کمی پورا کر کے' اس کے بگڑے ہوئے توازن کو برقرار رکھتے ہوئے اس میں حسن کا احیاء کرنا۔ اس سے ان کی نشوونما ہوتی چلی جاتی ہے' جن کی محنت کی کمائی ان کی ضروریات کے لئے مکتفی نہ ہو۔ تاکہ ان پر عدل کیا جاسکے۔

ظلم عدل کا نقیض ہے' جو معاشرہ میں خوف و حزن کا موجب بنتا ہے۔ لہٰذا مملکت کا یہ بھی فریضہ ہوتا ہے کہ وہ ایسے قوانین بنا کر ان پر عمل کروائیں تاکہ ظلم بھی نہ رہے اور امن بھی ہو۔ اس سے ہر شخص کو حقیقی اطمینان دلا کر عدل کا تقاضہ پورا ہوسکتا ہے۔

لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ (2:279)

نہ کسی پر ظلم کرو اور نہ ہی اپنے آپ پر ظلم ہونے دو۔

اس سے معاشرہ میں

فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (2:38)

لوگوں کو کسی قسم کا خوف اور حزن نہیں ہوگا۔

قانون کی دانستہ خلاف ورزی جرم کہلاتی ہے' چونکہ اس سے نظامِ عدل ٹوٹ جاتا ہے۔ اس کی روک تھام جرم کی سزا سے کی جاتی ہے' اسے قصاص کہتے ہیں۔ اس کے متعلق قرآن کی ہدایت ہے:

وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (2:179)۔

اے صاحبانِ عقل وبصیرت! تمہارے لئے قصاص میں زندگی کا راز پوشیدہ ہے تاکہ تم متقی بن سکو۔

اس لئے کسی کو اجازت نہیں دی جاسکتی کہ وہ کسی کو ناحق جان سے مار دے۔

مَنْ قَتَلَ نَفْسًۢا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا ؕ (5:32)۔

جو کوئی قتل کرے ایک جان کو بلا عوض جان کے یا بغیر فساد کرنے کے ملک میں تو گویا قتل کر ڈالا اس نے سب لوگوں کو اور جس نے زندہ رکھا ایک جان کو تو گویا زندہ کر دیا سب لوگوں کو۔

عدل کا یہ بھی تقاضا ہے کہ ہر شخص اپنی ذمہ داری خود اٹھائے۔ صلاحیت رکھتے ہوئے دوسروں پر بوجھ نہ بنے۔

وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ اِلَّا عَلَيْهَا ۚ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ۚ (6:164)

کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔

کوئی کسی کی محنت کے ماحصل کو نہ غصب کر سکے گا نہ اس میں کمی۔ اسے اس کے واجبات پورے کے پورے حاصل ہوں گے۔

وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ۝۳۹ (53:39)

انسان کو وہی ملے گا، جس کی اس نے محنت کی ہو۔

اس سلسلے میں قرآن کی تعلیم یہی ہے کہ جو کام کرنے کے قابل ہونے کے باوجود دوسروں کی محنت کے ماحصل پر زندگی بسر کرتا ہے۔ وہ گداگر ہے۔ خواہ کتنا ہی دولت مند کیوں نہ ہو۔ جو لوگ محنت سے معذور ہو چکے ہوں، قرآن دوسروں کی فاضلہ دولت میں سے ان کے حصہ کو حق قرار دیتا ہے۔

اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ۝۲۴ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ۝۲۵ (70:23-25)۔

لوگوں کے (فاضل) اموال میں سائل ومحروم کا حق ہے (یعنی خیرات نہیں)۔

نفاذ عدل میں قرآن نہ صرف مملکت کو اس کی ذمہ داریوں سے آگاہ کرتا ہے، بلکہ اسلامی مملکت کے شہریوں کو بھی انفرادی طور پر فرائض سونپتے ہوئے ہدایت کرتا ہے کہ:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ ۚ اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا ۣ فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓى اَنْ تَعْدِلُوْا ۚ وَاِنْ تَلْوٗٓا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ۝۱۳۵ (4:135)

اے مومنو! تم ہمیشہ عدل کے علمبردار بن کر رہو۔ شہادت صرف اللہ کے لئے دو خواہ وہ خود تمہارے اپنے خلاف کیوں نہ جائے۔ فریق معاملہ خواہ مالدار ہو یا غریب اللہ تم سے زیادہ ان کا خیر خواہ ہے۔ لہٰذا اپنی خواہش نفس کی پیروی میں

عمل نہ کرو اور اگر تم نے لگی لپٹی بات کہی یا سچائی سے پہلو بچایا تو جان رکھو جو کچھ تم کرتے ہو اللہ کو اس کی خبر ہے۔

قرآن میں خصوصی طور پر وکلاء کے لئے بھی ہدایت ہے۔

وَلَا تَكُنْ لِّلْخَآئِنِيْنَ خَصِيْمًا ﴿۱۰۵﴾ (4:105)

تو خیانت کرنے والوں کے (Cause) کو (Plead) کرنے والوں میں سے مت ہو۔

بلکہ ان کو اس کوشش میں رہنا چاہئے کہ:

فَلَنْ اَكُوْنَ ظَهِيْرًا لِّلْمُجْرِمِيْنَ (28:17)۔

میں کبھی مجرموں کا پشت پناہ نہیں بنوں گا۔

آخر میں قانون کے متعلق قرآن کے بنیادی اور اساسی اصول پر روشنی ڈالنا چاہوں گا۔ ارشادِ خداوندی ہے کہ:

وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ؕ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ (6:115)۔

اس (قرآن) میں 'خدا کا ضابطہ قوانین یعنی کلمات تمام صداقتوں کو اپنے اندر لئے' اور عدل و توازن کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے' مکمل ہو چکے ہیں۔ اب ان کلمات میں کوئی تغیر و تبدل کرنے والا نہیں۔

دوسری جگہ ہے کہ:

وَلَا تَجِدُ لِسُنَّتِنَا تَحْوِيْلًا ﴿۷۷﴾ (17:77)۔

اور تو ہماری سنت میں کبھی تبدیلی نہیں پائے گا۔

یہاں دونوں آیات میں قانون جب الفاظ کی شکل میں ہو' تو اسے کلمہ کہیں گے اور جب وہ عمل میں آ جائے تو اسے سنت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ عدل میں غیر متبدل قانون کی بہت اہمیت ہے۔ قرآن میں قانون کا لفظ نہیں آیا۔ دراصل اس زمانہ میں قانون کا لفظ ابھی روشناس ہی نہیں ہوا تھا دیکھا جائے تو قانون سے مراد یہ ہے کہ:

If.... then.... always

اگر تم ایسا کرو گے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا اور ہمیشہ ایسا ہی ہوگا۔

جب قانون کی یہ اصطلاح نظامِ کائنات کے ضمن میں استعمال کی جائے تو اس سے مراد ہوتی ہے سلسلہ علت و معلول (Cause & effect) یعنی فلاں بات کا نتیجہ یہ ہوگا۔ یا اس بات کا سبب یہ ہے۔

اللہ تعالیٰ قادرِ مطلق ہے۔ لیکن اس نے اپنے لامحدود اختیارت اور لا انتہا اقتدارات پر خود ہی کچھ پابندیاں عائد کر لی ہیں۔ انہی پابندیوں کا نام قانون خداوندی ہے۔ قرآن نے قانون کو امر کے نام سے بھی متعارف کرایا ہے۔

وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ قَدَرًا مَّقْدُوْرًا ﴿۳۸﴾ (33:38)

اور اللہ کا امر اس کی مشیت کی رو سے مقرر شدہ پیمانوں کے مطابق بنتا ہے۔

انہی قوانین کی پابندی میں ہی کائنات کا نظام حسن وخوبی سے چل رہا ہے۔ اس قسم کے قوانین اس نے انسانی زندگی کے لئے بھی عطا کر دیئے ہیں اور کہہ دیا ہے کہ اگر تم ان کے مطابق چلو گے' تو یوں ہوگا۔ ان کی خلاف ورزی کرو گے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا۔ اس کو قانونِ مکافاتِ عمل کہا جاتا ہے۔ یہ قوانین غیر متبدل اور اٹل ہیں اور ہر انسان پر یکساں طور پر حاوی ہیں۔ زمان و مکان کا اختلاف یا شخصیتوں کی تفریق ان پر قطعاً اثر انداز نہیں ہوتی۔

حضرت عمرؓ نے انہی اصولوں کی مدد سے عدل کے قانونی پہلو کی درجِ ذیل فہرست روشناس اور نافذ کرائی تھی۔ یاد رہے کہ یہ اصول آج سے تقریباً پندرہ صدیاں پہلے مرتب ہوئے تھے۔ آج بھی مغرب کے قانون کی جو تعلیم نصاب میں دی جا رہی ہے کہ وہ اب انہی اصولوں کو متعارف کرا رہے ہیں اور یا پھر ابھی بھی ان کی تلاش میں ہیں:۔

(1) قضا' فریضہ خداوندی اور سنت رسول ﷺ اللہ ہے۔ اس سے اس ذمہ داری کی اہمیت واضح ہے۔

(2) فیصلے میں نتیجہ پر ہر پہلو پر غور و تحقیق کے بعد پہنچنا چاہئے اور اس میں تاخیر نہیں کرنی چاہئے۔

(3) فیصلہ تحریری ہونا چاہئے۔ زبانی فیصلہ بے سند ہوتا ہے۔ (4) فیصلہ وہی فیصلہ کہلا سکتا ہے جسے نافذ کر دیا جائے۔

(5) دورانِ سماعت' فریقین کے ساتھ ایک جیسا برتاؤ کرو تا کہ کمزور فریق' انصاف کی طرف سے مایوس نہ ہو۔

(6) بارِ ثبوت مدعی کے ذمہ ہوگا۔ (7) مدعا علیہ اگر شہادت نہ پیش کر سکے تو اس سے حلف لے لینا چاہئے۔

(8) فریقین میں مصالحت کی کوشش کرنی چاہئے مگر ایسی مصالحت نہیں جس میں حلال کو حرام اور حلال کو حرام کا درجہ دے دیا جائے۔

(9) اگر آپ نے آج ایک فیصلہ کیا ہے اور کل کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے تو اس فیصلہ سے رجوع کر لینا آپ کے منصب کے منافی نہیں۔

(10) جب کسی معاملہ میں نصِ صریح نہ ملے تو اس کے نظائر و امثال کی جستجو کرو اور ان پر غور و فکر کے بعد فیصلہ کرو کہ کونسی بات حق سے زیادہ قریب ہے۔ اس پر اعتماد کرو۔

(11) مدعی یا مدعا علیہ میں سے جو بھی ثبوت یا گواہ پیش کرنے کے لئے مہلت مانگے' اسے مہلت دے دو۔

(12) گواہی کے لئے ہر مسلمان ثقہ ہے بجز ان کے جنہیں کسی جرم کی پاداش میں ساقط الاعتبار قرار دے دیا گیا ہو۔

(13) فیصلہ ظاہری بیانات اور شہادت پر ہوگا۔ پوشیدہ امور اور نیتوں کا علم صرف خدا کو ہے۔

(14) تمہارے دل میں اہلِ مقدمہ کی طرف سے کبھی خفگی' اکتاہٹ یا چڑچڑاپن پیدا نہیں ہونا چاہئے۔

(15) ہمیشہ تحمل اور بردباری سے کام لینا چاہئے۔ (16) شبہ کی صورت میں' سزا دینے کے مقابلہ میں سزا نہ دینا بہتر ہے۔

(17) غصے کی حالت میں فیصلہ نہ کرو۔ اسے ملتوی کر دو۔ (18) یاد رکھو۔ قاتل' مقتول کا وارث نہیں ہو سکتا۔

(19) لوگوں کے فیصلے کرتے وقت' ہمیشہ اپنے آپ کا محاسبہ کرتے رہو۔

(20) دوسروں سے بات اس انداز سے کرو، جس سے صاف صاف مطلب اس کی سمجھ میں آ جائے۔

(21) اگر کوئی شخص ایسی زبان میں کسی کو امان دے یا نہ دے جس کو وہ نہ سمجھتا ہو اور وہ اسے اپنے لئے امان سمجھ لے، تو اسے امان ہی تصور کرو۔

(22) اگر کوئی معقول عُذر پیش کرے، تو اسے قبول کر لو۔

(23) مجبور اپنے کسی فعل کے لئے قابلِ مواخذہ قرار نہیں پا سکتا۔

(24) اپنے ایک گورنر کو سرزنش کی کہ تم نے لوگوں کو کب سے غلام بنانا شروع کیا۔ ان کی ماؤں نے تو انہیں آزاد جنا تھا۔

(25) جو قاضی کسی فریق مقدمہ کی پوزیشن کا خیال رکھتا ہو، وہ انصاف نہیں کر سکتا۔

سانحہ ہائے ارتحال

بزم طلوعِ اسلام لانڈھی کراچی کے نمائندہ سرور بن پاکستان طویل علالت کے بعد کراچی میں وفات پا گئے ہیں۔ مرحوم قرآن اور پاکستان کے عاشقِ صادق تھے اور عمر بھر اپنے نصب العین کے لئے سرگرم رہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اعلیٰ علیین میں جگہ دے اور پسماندگان کو صبر کی توفیق دے۔ ادارہ مرحوم کے اہلِ خانہ اور دوستوں کے غم میں برابر کا شریک ہے۔

بزم طلوعِ اسلام ڈی ایچ اے کراچی کے دیرینہ ساتھی محترم محمد سلیم صاحب (والد محترم آصف سلیم صاحب) کچھ روز قبل انتقال فرما گئے ہیں۔ محترم سلیم صاحب ماضی میں بزم کے کافی فعال اور سرگرم رکن رہے اور بہت سے افراد کو فکر قرآنی سے روشناس کرایا۔ کراچی کی دونوں بزموں کے اراکین نے مرحوم کی نمازِ جنازہ میں شرکت کی۔ ہم محترم سلیم صاحب کے اگلے مرحلۂ حیات کی بلندی کے لئے دعا گو ہیں۔ اور مرحوم کے اعزہ و اقربا کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔

ضروری گذارش

جن قارئینِ طلوعِ اسلام کو ماہنامہ طلوعِ اسلام بذریعہ ڈاک ملتا ہے ان سے گذارش ہے کہ وہ ادارہ کے اس نمبر: 0318-2221851 پر اپنا فون نمبر میسج کر دیں۔ براہِ کرم اپنے فون نمبر کے ساتھ اپنا نام، شہر کا نام اور ممکن ہو تو خریداری نمبر بھی لکھ دیں۔ شکریہ

(ناظم ادارہ طلوعِ اسلام)

ڈاکٹر اعجاز رسول

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

قرآن اور انسانی عقل

انسان ایک عظیم مقصد کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ وہ مقصد سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے اس بات کو سمجھا جائے کہ انسان کن اشیاء کا مرکب ہے۔ انسان کے پاس بنیادی طور پر درج ذیل قوانین ہیں۔

1۔ انسان کا احساس شعور (Sense of Identity): یہ انسان کی زندگی کے دوران تبدیل نہیں ہوتا۔

2۔ انسانی جذبات: ان کی تعداد ایک اندازے کے مطابق تین ہزار سے اُوپر ہے۔ اس سے اوپر ہر جذبہ (Emotion) کا پیمانہ ہے۔ مثلاً ہم ناراض ہوتے ہیں تو یہ ناراضی تھوڑی سے لیکر بہت زیادہ ہوسکتی ہے۔ اس طرح ہمیں غصہ آتا ہے تو یہ بھی تھوڑی مقدار سے بہت بہت زیادہ ہوسکتا ہے۔ یعنی ہر جذبہ کا Scale ہے۔

3۔ ہم سوچتے ہیں: سادہ سوچ وہ ہے جس میں ہم زیادہ زور نہیں دیتے۔ جیسے ہم کسی کو ملتے ہیں اور علیک سلیک ہوتی ہے۔ عام لیول کی گفتگو ہوتی ہے۔

4۔ ہم سوچ کے متعلق سوچ سکتے ہیں: اسے عام طور پر Meta Cognition کہتے ہیں۔ یہ قابلیت ہمیں قوت فیصلہ دیتی ہے۔ اس قابلیت کی وجہ سے ہمارے اندر ہدایت نہیں رکھی جاسکی کیونکہ Free will اور Internal Guidance ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں۔ یہ ایک عظیم قابلیت ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس کے ذریعہ ہمیں لاانتہا قوتوں کا مالک بنایا ہے اور اس کا استعمال اگر قرآنی فکر کے اندر رہ کر کیا جائے تو زندگی ایک نئی زندگی بن جاتی ہے۔ اس پر ہم بعد میں تفصیل سے روشنی ڈالیں گے۔

5۔ ہماری یادداشت: یہ قابلیت انسانی سوچوں کے ساتھ بے پناہ قوتوں کی مالک ہے۔ ہم اپنی یادداشت میں اپنی کوشش سے علم کا اضافہ کرسکتے ہیں۔ ہم دوسروں کے کام سے سیکھ سکتے ہیں۔ بنیادی لیول سے یعنی نام یاد رکھنے سے لیکر انتہائی مشکل Mathematical concepts کو ہم یاد کرسکتے ہیں۔ اس سے ہم قرآنی فکر کو اپنے ذہن میں یاد کرکے فائدہ اٹھاسکتے ہیں۔

6۔ انسانی جسم: اس میں اپنی ہیئت اور ڈیزائن کی وجہ سے بہت قوت رکھی گئی ہے۔ اس انسانی جسم کی بدولت ہم نے سائنس کے میدان میں علم حاصل کرکے قدرتی وسائل پر قابو پاکر بے شمار فائدے حاصل کرلیے ہیں۔ انسانی جسم کا علم ہم

سائنس کی روشنی میں حاصل کر رہے ہیں۔ اس کے اندر بھی بے شمار قوتیں کام کر رہی ہوتی ہیں۔ لیکن اس کی سب سے بڑی کمزوری اس کی بنیادی ضروریاتِ زندگی ہیں اور اس کی موت ہے۔ ان دو باتوں کا سمجھنا بہت ضروری ہے اگر ہم انسانی زندگی کی اہمیت سمجھنا چاہتے ہیں۔ اسی انسانی جسم کے استعمال سے ہم مزید ارتقائی منزلیں طے کر سکتے ہیں۔ لیکن انسانی جسم کی ضروریاتِ زندگی صرف پورا کرنا ہماری عقل کا مقصد نہیں ہونا چاہیے۔

7۔ دوسرے انسان: انسانی زندگی اکیلے نہیں گزر سکتی ہے۔ اسے دوسرے انسانوں کی ضرورت ہے۔ انسان کے اندر ایسے جذبات ہیں جو کہ اسے دوسرے انسانوں سے تعلقات پر مائل کرتے ہیں۔ اگرچہ انسان اپنی قوت فیصلہ سے یہ فیصلہ کر سکتا ہے کہ وہ کس کے ساتھ اپنے تعلقات استوار کرنا چاہتا ہے۔

8۔ زمین: انسانی زندگی کے لیے زمین کے وسائل بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ جدید سائنس کی روشنی میں ہمیں علم ہے کہ زمین ہی وہ Planet ہے جس پر زندگی ممکن ہے۔ انسان ان وسائل سے اپنے اور دوسرے انسانوں کے فائدہ کے لیے کام کر سکتا ہے۔ موجودہ زمانے میں انسان نے زمین کا ایک ایک کونا چھان مارا ہے اور مزید تحقیقات ہو رہی ہیں تاکہ زمین کے وسائل سے فائدہ اٹھایا جا سکے۔ زمین کو انسان نے مختلف ملکوں میں تقسیم کر رکھا ہے اور باہمی مقابلے سے بے شمار نئے نئے طریقے ایجاد ہو رہے ہیں تاکہ ایک دوسرے سے سبقت لی جا سکے۔

9۔ کائنات: زمین سے آگے کائنات ہے۔ جس کا علم انسان نے کچھ حد تک حاصل کیا ہے اور مزید حاصل کرنے کی کوشش جاری ہے۔ انسانی سوچ کی چونکہ کوئی متعین حد نہیں ہے اس لیے انسان جب تک زندہ رہتا ہے اپنی زندگی اور اردگرد کی کائنات کے متعلق سوچتا رہتا ہے۔

10۔ قرآنی فکر: انسان اپنی سوچوں کا استعمال کر کے اپنی زندگی کے دوران بے شمار سوالات کا جواب ڈھونڈتا رہتا ہے۔ اِن سوالات کا نتیجہ یہ ہے کہ انسان نے اتنی ترقی کر لی ہے اور دوسرے Planets اور Stars کے متعلق علم حاصل کر لیا ہے۔ اگرچہ انسان اپنی جسمانی کمزوری (Physical limitation) اور وسائل نہ ہونے کی وجہ سے دوسرے Planets پر نہیں جا سکتا لیکن اپنی عقل اور دماغی قوت کی وجہ سے وہ اپنی زندگی کو اس کائنات کے ساتھ Relate کر سکتا ہے۔ پھر Telescopes وغیرہ کی وجہ سے وہ اس قابل ہو گیا ہے کہ اس اردگرد کی کائنات کے متعلق علم حاصل کر سکے۔ لیکن پھر بھی کچھ ایسے سوالات ہیں جن کا علم انسان کے پاس نہیں ہے مثلاً

(ا)۔ اس کی زندگی کا مقصد کیا ہے۔ (ب)۔ یہ کائنات کیسے وجود میں آئی۔

(ج)۔ اس کائنات کا اختتام کیسے ہوتا ہے۔ اگرچہ عام انسانی زندگی تقریباً 80-102 سال ہے لیکن اس کی فکر لاکھوں سالوں کی رہتی ہے۔ (د)۔ اس کائنات کو کس نے بنایا ہے اور اگر کسی نے بنایا ہے تو اس کو ہم کیسے سمجھ سکتے ہیں۔

(ر)۔ زندگی ختم کیوں ہو جاتی ہے۔ خاص کر جو انسان صاحبِ قوت اور امیر ہیں اُن کا دل نہیں چاہتا کہ اُن کو موت آئے۔

(ز)۔کیا موت کے بعد بھی زندگی ہے۔اگر زندگی ہے تو اُس کی کیا شکل ہوگی اور کیا ہم اُس کو اپنی موجودہ سطح پر سمجھ سکتے ہیں۔اگر سمجھ نہیں سکتے تو اُس سے کس طرح فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

(س) کیا God ہے تو کون سا نظریہ ایسا ہے جس سے انسان ذاتی طور پر فائدہ اٹھا سکے۔

اس طرح کے اور سوال ہیں جو کہ انسان کے دماغ میں آتے ہیں اور وہ ان کی تلاش میں لگا رہتا ہے۔اور اپنا وقت پورا کر کے موت سے ہم کنار ہو جاتا ہے۔اس کو ہم ایک Equation کی صورت میں بھی لکھ دیتے ہیں۔

Human Life = Sense of Identity + Emotions + Thinking +

Metacognition

+ (Human Memory) + (Human Body + other Human Beings)

+ (Earth + Universe) + the Quran (optional)

یہ ہمارا مشاہدہ ہے کہ انسانی زندگی میں انسان ہی مسائل پیدا کرتے ہیں اور انسان ہی مسائل کا حل تلاش کرتے ہیں۔ چونکہ انسان مل جل کر رہتے ہیں۔اس لئے آئین و اقدار کی ضرورت ہوتی ہے۔بنیادی طور پر انسان اپنی خوشی کو بڑھانا چاہتا اور اپنی مشکلات کو آسان کرنا چاہتا ہے۔چونکہ انسانی جسمانی زندگی کا انحصار زمینی وسائل پر ہے اس لئے جو انسان زیادہ طاقتور ہے وہ زیادہ وسائل پر قبضہ کرنا چاہتا ہے۔جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دوسرے انسان بنیادی ضروریات زندگی سے محروم ہو جاتے ہیں یہ طاقتور انسان انسانوں کے ہی ذریعہ دوسروں پر قابو رکھتے ہیں۔انہی وجوہات کی بنا پر ہماری موجودہ زندگی میں مختلف قوموں نے جنم لیا ہے۔ہر قوم کے اوپر ایک حکمران طبقہ ہے جو کہ دوسرے اپنے جیسے انسانوں کو اپنے کنٹرول میں رکھتا ہے۔اس کے لیے نظام کوئی بھی ہو (سوائے قرآنی نظام کے) عام انسانوں کا تعلق حکمران طبقہ کے ساتھ حاکم اور محکوم کا ہوتا ہے۔لیکن ان سب کی زندگی کا مقصد ایک ہی ہوتا ہے کہ انسانی جسم کی ضروریات زندگی کو پورا کیا جائے اور اپنے لئے زیادہ سے زیادہ اکٹھا کر لیا جائے یعنی سرمایہ دار نظام۔

ابھی ہم قرآنی فکر اور انسانی عقل کے باہمی تعلق کی طرف چلتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ انسانی عقل اس سے کس طرح فائدہ اٹھا سکتی ہے۔

انسان جتنا بھی اس سوال کا جواب نہ چاہے یہ ایک حقیقت ہے کہ اس کائنات اور انسان کی پیدائش کے پیچھے کوئی قوت کارفرما ہے جو کہ ایک قائدہ اور قانون کے مطابق کام کرتی ہے۔اس قوت کے چند ایک اصول ہیں جو کہ مشاہدہ سے ہم سب کے علم میں ہیں۔

(1) کائنات جس کا ہم روز مشاہدہ کرتے ہیں۔ ایک قانون کے تحت کام کر رہی ہے مثلاً Gravity اور Rotation۔

(2) انسانی زندگی کے مقابلہ میں اس کائنات کی عمر (Age) کہیں زیادہ ہے۔ اس سے ہمیں علم ہوتا ہے کہ جسمانی عمر کے لیول پر ہماری اہمیت بہت کم ہے۔

(3) اگر ہم سوچیں تو یہ ساری کائنات بے مقصد ہے اگر ہم اور آپ اس کے متعلق نہ سوچ سکیں یہ ہماری سوچیں ہیں جو کہ اس کائنات کو کوئی Meaning دیتی ہیں اور اس سے کائنات ہمیں Meaning دیتی ہے۔

(4) اوپر سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ اگر ہم صرف جسم ہوں تو ہماری کائنات بے مقصد ہے۔ لیکن اگر میرے اندر ایک ذات ہے۔ یعنی میرے خیالات اور سوچیں تو یہ کائنات ایک ایسی حیثیت کے طور پر اُبھرتی ہے کہ جس سے یہ میری زندگی کو ایک مقصد عطا کرتی ہے۔ میں اس کائنات کے لیے نہیں ہوں۔ بلکہ یہ کائنات میرے لیے ہے۔ میں اس کو ایک Opportunity کے طور پر استعمال کر کے اس کی حدوں سے آگے جا سکتا ہوں۔

(5) یہ کائنات اور ہم ایک حقیقت ہیں جس کا مشاہدہ ہم روز کرتے ہیں۔ لیکن یہ قوتِ مشاہدہ بذات خود ایک حقیقت ہے جس کو ہم اپنے ذہن کے لیول پر سمجھتے ہیں۔ ہمیں اپنی ذات کا احساس ہر وقت رہتا ہے (غالباً نیند کی حالت میں یہ احساس غالب آجاتا ہے)۔ ہمیں اپنی ذات اور اپنے وجود کا احساس رہتا ہے اور ہمیں علم ہوتا ہے کہ ہم زندہ ہیں اور اپنی پسند اور ناپسند وغیرہ کے احساس سے ہمیں اپنی Personality ابھی علم رہتا ہے۔ یہ انسانی وجود ہمارے جسمانی وجود سے علیحدہ چیز ہے جو کہ اگرچہ نظر نہیں آتی لیکن اس کا احساس ہمیں اس کے وجود کے متعلق علم پہنچاتا ہے۔

(6) یہاں سے ہم ایک Step آگے چلتے ہیں۔ ہم اپنی زندگی میں کئی کام کرتے ہیں مثلاً کھانا، لکھنا، گاڑی چلانا وغیرہ۔ یہ سب کام ہمارے ذہن کی پیداوار ہیں۔ ہم کوئی کام نہیں کر سکتے اگر ہم اُس کے متعلق پہلے سے سوچتے نہیں ہیں۔ انسانی کاموں کے پیچھے کوئی نہ کوئی مقصد ہوتا ہے۔ اتنی بڑی کائنات کا بھی کوئی نہ کوئی مقصد ہوگا؟ اس مقصد کا پتہ چلانا ہمارا کام ہے۔ اس لیے کہ اگر میری زندگی کا کوئی مقصد ہے۔ تو اُس مقصد کو ڈھونڈنا بھی میرا مقصد ہونا چاہئے۔

(7) ہمارا یہ بھی مشاہدہ ہے کہ ہم نے جو بھی قابلیت حاصل کی ہو مثلاً اعلیٰ تعلیم، اعلیٰ ہنر، تجربہ وغیرہ ہم اپنے بچوں کو بذریعہ پیدائش نہیں دے سکتے۔ ہر بچے کو جسمانی طور پر ہماری شکل اور کچھ Genes وغیرہ تو مل جاتے ہیں لیکن Acquired Abilities نہیں مل سکتیں۔ یہ بھی قانون کا حصہ ہے۔

(8) اپنی زندگی گزارتے ہوئے ہم دوسروں کے ساتھ Interact کرتے ہیں۔ اس کا اثر دوسروں پر بھی پڑتا ہے اور دوسروں کا اثر ہم پر پڑتا ہے۔ ہم نے مشاہدہ کیا ہے کہ دوسروں کے ساتھ ہمارے رویہ اور الفاظ کا اثر بعض اوقات نتیجہ کافی دیر بعد پیدا کرتا ہے۔ مثلاً اگر کسی نے میرے ساتھ زیادتی کی ہے تو میں اُس کو اُس وقت شاید کسی وجہ سے برداشت کروں لیکن بعد میں اگر احساس قائم رہے تو میں اس کا بدلہ لے سکتا ہوں۔ اسی طرح بعض اوقات دوسروں کے اعمال کا دوہرا اثر ہوتا ہے مثلاً کسی نے اگر ہمیں دھکا دیا ہے تو اُس کے نتیجہ میں جسم کو بھی تکلیف ہوگی اور ساتھ ہی ذہنی اذیت بھی ہوگی۔

(9) ہمیں وقت کا احساس رہتا ہے۔ دن اور رات کے گزرنے کا احساس اور اپنی عمر کے گزرنے کا احساس ہمیں کام جلدی کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ ساتھ ہی انسانی ضروریات کے لیے ہمیں زندگی میں کوشش کرنی پڑتی ہے۔

(10) ہم کس جگہ پیدا ہوئے ہیں اور کس گھر میں پیدا ہوئے ہیں۔ یہ ہمارے کنٹرول میں نہیں ہے۔ بچہ کو پیدائش کے وقت کسی چیز کا علم نہیں ہوتا کہ اُس کا رنگ، ذات، ماں باپ، مذہب، شکل، Gender وغیرہ کیا ہوں گی وہ صرف ان باتوں کا احساس کچھ سالوں بعد کرتا ہے۔ پیدائش کے وقت دوسرے بچوں کے برابر ہوتا ہے اور صرف اپنی ذات لیکر آتا ہے۔ باقی سب چیزیں اضافی ہوتی ہیں۔

ابھی ہم قرآن کی طرف آتے ہیں اور مختصراً دیکھتے ہیں کہ یہ ہمیں کیا دیتا ہے۔

(1) قرآن انسانی زندگی کا مقصد انسانی اعمال کے نتیجہ کو ظاہر کرنا بتاتا ہے اور قانونِ مکافاتِ عمل کو تفصیل سے بیان کرتا ہے۔ (45:22) اس آیت میں کائنات کا مقصد بتایا گیا ہے۔ اور ساتھ ہی یہ بھی اعلان کر دیا ہے کہ کسی کے ساتھ ناانصافی نہیں ہوگی۔ چونکہ اعمال کا اثر ہماری ذات پر ہوتا ہے اس لئے ناانصافی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

(2) قرآن انسانی سوچ کی پیداوار نہیں ہوسکتا کیونکہ یہ انسانی سوچ کے متعلق ہمیں حقیقت سے روشناس کرواتا ہے اور چونکہ ہم انسان قرآن کی طرح سوچ نہیں سکتے اس لیے قرآن ہمیں کہتا ہے کہ کوئی انسان ایسا سوچ کر لکھ نہیں سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی انسان قرآن کا متبادل نہیں بنا سکتا اور نہ ہی کوئی قرآنی آیت بنا سکتا ہے۔

(3) چونکہ انسان قرآن کی طرح سوچ نہیں سکتا اور انسان کے اندر کوئی راہنمائی نہیں رکھی گئی اس لیے انسان کو قرآن بحیثیت رہنمائی کے اپنی سروس ایک Option کے طور پر آفر کرتا ہے۔ یہ انسان کی Free will کا استعمال ہے کہ وہ اس کی فکر کو استعمال کر کے اس آفر کو قبول کرے یا انکار کر دے۔

(4) قرآن کو ایک وحی کے طور پر قبول کرنے کے لیے عقل اور فکر کے استعمال کی اشد ضرورت ہے کیونکہ قرآنی فکر ہے ہی انسان کے ذہن کی رہنمائی کے لیے تاکہ انسانی فکر جن سوالات کے جوابات ڈھونڈتی ہے۔ قرآن اُن کے جوابات مہیا کرتا ہے ان جوابات کو پھر ہم اپنی زندگی کے تجربات اور Evidence پر پرکھ کر ان پر ایمان لاتے ہیں۔

(5) انسان کا ذہن چونکہ جذبات، خیالات اور یاداشت کا مرکب ہے۔ اس لیے انسان اپنی زندگی کے دوران مختلف شخصیات (Personality) سے گزرتا ہے۔ یہاں تک کہ Multi self تھیوری کے مطابق انسان کی شخصیت تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ قرآن اس کا آسان حل پیش کرتا ہے اور وہ کہتا ہے کہ اپنی عقل اور فکر کو استعمال کر کے اپنے Self کے لیول پر اللہ کو اپنا ماڈل بنالو اور اپنی یادداشت میں اس کو محفوظ کرلو۔ اس کے ساتھ مستقل اقدار کو سمجھ کر اپنی یاداشت میں محفوظ کرلو اس طرح ایک Integrated self وجود میں آجائے گا۔ ابھی جو بھی کام کرو گے اُس میں اپنے ذہن میں جو بھی مستقل قدر کی ضرورت ہے۔ اُس کو استعمال کرلو۔ نتیجہ وہ ملے گا جو قرآن کے اندر دیا ہوا ہے۔

(6) قرآن نے دوسروں کی مدد کا بار بار ذکر کیا ہے۔ ہر انسان کے Self کے آگے بڑھنے کے لیے ایک اہم ضرورت ہے۔ اس میں ایک بہت اہم بات ہے کہ وہ انسان کو انسانیت کے لیول پر سوچنے کا بار بار کہتا ہے۔ یہ اس لئے کہ انسان بغیر قرآن کے جغرافیائی حدود میں مقید ہو جاتا ہے۔ قرآن چونکہ انسانی ذہن کو تبدیل کرتا ہے تاکہ وہ پوری کائنات کے متعلق سوچنا شروع کر دے اس لیے وہ انسان کو دعوت دیتا ہے کہ وہ پوری انسانیت کے مسائل پر غور کرے اور ایسا وہ اپنے اردگرد کے ماحول سے ہی شروع کر سکتا ہے۔

(7) قرآن کی وحی ایک Seed کی طرح ہے۔ یہ ذہن انسانی کو تدریجاً Influence کرتی ہے اور انسان اپنی فکر کے ساتھ اس کو اپنے ذہن میں درجہ بدرجہ Grow کرتا ہے۔ اس سے انسان انفرادی مسائل کے حل سے انسانیت کے مسائل کے حل کے قابل ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ ممکن اسی وقت ہے کہ انسان کا ارادہ بھی انسانیت کے مسائل کا حل ڈھونڈنا ہو۔

(8) قرآن کے مطابق (اور ہمارے فکری مشاہدہ کی رُو سے بھی) اس دنیا اور اگلی دنیا کا اللہ ایک ہی ہے۔ اس لیے Self کے لیول پر یہاں سے دوسری دنیا تک کا سفر ایک ہی سلسلہ کی دو کڑیاں ہیں۔ اس لیے قرآن نے موت کو چکھنے سے تشبیہ دی ہے یعنی Self کے لیول پر انسان موت کا صرف ذائقہ چکھے گا (29:57)۔

(9) قرآن کا علم ہمیں اس قابل بنا دیتا ہے کہ ہم انسانی دُنیا اور قانونِ مکافاتِ عمل کو اللہ تعالیٰ کی نگاہ سے دیکھنے کے قائل ہو جائیں (انسان کی حد تک)۔ اس سے ہمیں اپنی قوتِ عمل کا اندازہ ہو جاتا ہے اور ذہنی طور پر اور عملی طور پر اندازہ ہو جاتا ہے کہ کس حد تک انسان اپنے اعمال کی دنیا میں آزاد ہے۔

(10) قرآن انسانی زندگی کے مسائل کی بہترین Explanation مہیا کرتا ہے جو کہ انسانی ذہن کی تسلی کر دیتا ہے۔ یہ عقل کے معیار پر پورا اُترتا ہے اور کوئی ابہام نہیں چھوڑتا۔ لیکن اس کے لیے شرط یہ ہے کہ انسان کھلے دماغ سے اس کی طرف آئے اور اس کے پیش کردہ حل کو غیر متعصب (Unbiased) ہو کر غور کر لے۔ مثلاً قرآن نے ایک بہترین Economic System دیا ہے جو کہ ہر انسان کے بنائے نظام حیات کے خلاف ہے اور دونوں انسانی حصوں کی تکمیل کرتا ہے یعنی انسانی جسم اور انسانی ذات۔

(11) ظاہری طور پر ایسا لگتا ہے کہ اگر انسان قرآن کی ہدایت کی طرف آیا تو شاید اُس کی قوتِ رائے کم ہو جائے گی یعنی اُس کی Free will محدود ہو جائے گی لیکن دراصل قرآنی فکر سے انسان کی Free will کا دائرہ لامحدود ہو جاتا ہے کیونکہ یہ فکر انسان کو عقل کی سطح پر پوری دنیا کو دیکھنے کی صلاحیت عطا کرتی ہے۔ ہر مرحلہ پر انسان کسی بھی مسئلہ کا حل Global لیول پر سوچتا ہے۔ پھر انسان خود کو پوری انسانی برادری کا فرد سمجھنے لگتا ہے چونکہ اس سوچ میں اگلی دنیا بھی آجاتی ہے۔ اس لئے انسان میں ''احساسِ آخرت'' پوری طرح بیدار ہو جاتا ہے۔ اس سے انسانی ذہن کی وسعتیں بڑھ جاتی ہیں۔

Manzil ba Manzil **(منزل بہ منزل)**

Chapter 4: Builder of Kaaba (*Mei'mar Haram* - معمارِ حرم) –

To leaders of Spring's caravan

(Tulu-e-Islam Convention, April, 1960)

Episode No. 2

By G. A. Parwez (Translated by: M. Alam)

But you can see how this strategy of Iblis is failing. No one is interested to hear nowadays whether "*the son of Marry is dead, or is he eternally alive?*" So, from the pulpits you won't hear such things now. The world wants real solutions to life's practical problems which can only be found in the Quran. That is why even the Mullah finds himself forced to talk about the Quran in his sermons from the pulpit. Just hear the sermons of different mosques. You will find that almost every speaker will be using abusive language against the Tulu-e-Islam but the content of the sermon will be mostly based on some article of Tulu-e-Islam. So, why do they use abusive language against Tulu-e-Islam while using its content? This is because their narcissistic ego and false pride does not allow them to accept the reality. In the words of the Quran: وَاِذَا قِيْلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ فَحَسْبُهٗ جَهَنَّمُ ؕ (2:206) – When they are asked to abide by the Divine Laws, their power-intoxication and false pride impels them towards greater destruction. But they have become used to deriving all the benefits from using the name of the Quran. So they keep doing it because people have deep affection for the Quran. But these Mullahs do not muster the courage to openly submit to the Quran's true message because that affects their religious profession:

The Sheikh stopped and looked around;
Then bowing his head entered the tavern!

Still better way to put it is:

Modesty heard and eyes became intoxicated;
Pious one came to the wine party unexpected!

But my dear friends, this does not mean that you should take it easy if the demand of the times is knocking out the darkness of religion. Not at all? On the contrary, this is the time for you to double your effort. See! How beautifully and pithily the Quran puts this: مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعِزَّةَ فَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ جَمِيْعًا ؕ اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهٗ ؕ (35:10) – Therefore if any nation desires to regain life with power, strength, superiority and respect, it should keep in mind that all this can only be achieved by following Divine Laws. The nation should also keep in mind the fundamental reality that in order to achieve further development and ascendancy towards greater heights, two things are important: 1) to have an ideology or concept of life which has the inherent capacity to grow, flourish and achieve pleasant results; and 2) righteous deeds which help lift this ideology skywards. Divine Guidance has the capability to continue growing

without any external support. However its speed is very slow compared to human scale – Allah's one day may be as long as fifty thousand years; but it speeds up when it is supported by human deeds.

An observer starts saying:

One giant step of deep passion ended the story abruptly;
I held that the Earth and heaven were stretched infinitely!

So, O torch bearers of the Quranic message in this dark period! Step forward. Signs towards the Quranic destination have started appearing. The world is waiting to hear the real message of the Quran. Make sure you do not get tired and stop for respite. Otherwise, you will feel sorry for why you stopped when the world was eager to listen to your message:

When the world was listening intently to us;
We ourselves slept in the middle of the story!

In your awakening my friends, there is secret for awakening of humankind. Therefore: قُمْ فَأَنْذِرْ ۝ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ۝ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ ۝ (74:2-5) – Arise and warn the slumbering people of the outcome of their erroneous ways of life. And establish the Order of universal sustenance so that it manifests the sovereignty of your Sustainer and shows that all greatness should only belong to Him. You too will thus attain eminence in the world. To achieve this it is very important that you purify your own conduct, character and personality; and that you keep this mission free from every kind of undesirable element. This system cannot be operated mechanically by anyone. The mission should be clean and transparent; and the vision and character of all those who participate in it should be pure. Take such companions with you and give them the training that would inculcate strength in their personalities, with which they can undertake this big responsibility with ease. They should not tremble when they are asked to rise up bearing this heavy responsibility.

We saw an example in the last convention how the demands of time are bringing the world closer and closer to the Quran and how the custodians of religion have to bow down before them. This was about the popular support for the recent land reform legislation and we saw how the religious establishment could not raise its obscurantist voice against it because despite their belief in unfettered capitalism and unlimited land ownership. This year the government has reformed a sharia law pertaining to inheritance that is now closer to the Quran. In the sharia law an orphan child cannot get any share from his deceased father's inheritance if the grandfather is still alive. The sharia also openly allows a husband marrying four wives; and gives sole authority of divorce to the husband. The wife is completely helpless in this regard. These laws have been instrumental in spreading corruption and grief in the society.

But due to popular opposition of these anti-Quran laws, the law-commission proposed reforms in these family related sharia laws as well. Although these proposed laws are not all exactly according to the Quran but they are definitely closer to it than the traditional sharia laws. And the government has accepted these laws and these will be given legal status making life easier for a vast majority of people who are suffering under weight of the current traditional sharia laws. We congratulate the government for this reform and request that it should continue to move toward the Quranic laws. We also hope that it never enacts any laws that are against the Quran. Therefore, this message must be communicated to the law-commission: that only that law could be called Islamic which is in accordance with the Quran.

***

Organization of Tulu-e-Islam movement

Now, my brothers, I want to say something about our movement. As I have been saying all along, this movement has nothing to do with any religious or political party. This is an organized effort to spread the Quranic thought. As for the Quranic thought that is presented here, if you accept it because it is my thought – i.e., your authority is that Parwez is saying this – then please remember! You have neither understood the Quran nor this movement. The authority for Quranic thought cannot be Parwez nor any other human being. I present the Quran according to my understanding. It is your duty to critically examine my explanation of the Quran and then come to your own conclusion with your own mind to see whether or not my explanation is right. If you agree then it is your own understanding of the Quran directly on the basis of the authority of the Quran, not my authority. Please listen again: the day you make any human as an authority in the دین (*Deen*) instead of the Quran, then you laid the foundation of sectarianism that day. And you already know that creating sect in دین (*Deen*) is شرک (*Shirk*) according to the Quran.

Those friends who, after due thought and understanding like this, find the message presented by Tulu-e-Islam as right form a collective unit called Bazm-e Tulu-e-Islam, whose purpose is to collaborate and coordinate their effort in an organized form to spread the Quranic thought presented by Tulu-e-Islam. It is necessary for the members of the Bazms to have loving and amicable relationships with each other. Their life should be a living example of رُحَمَآءُ بَيۡنَهُمۡ (48:29) – they are kind hearted and sympathetic amongst themselves. This is only possible if they trust each other. The unity of goal creates this type of trust. It is necessary for you not to give importance to trivial differences related to this organized effort. Don't insist on your opinion to be accepted by others. Try to embrace others as much as possible in your heart.

Remember that these individual pearls of the thread have been collected with great effort. Don't try to break the thread of this bond.

But please remember! There is no point in keeping someone with you who does not agree with the Quranic thought presented by Tulu-e-Islam. Your organization is completely different from the organization of the political parties. The strength of political lies in the numbers of its members. That is the reason these parties try to do everything possible to keep their members within the party. But your organized effort is based on harmony of thought. So, if a person is not fully committed with all his heart to spread this message then there is no point in keeping him within your organization. But, on the other hand, if the Quran has entered in someone's heart, and for emergent emotional reason this person has left you, then sooner or later he will come back:

Those leaving due to some excuse;
Will come back to you somehow!

This is because he won't receive such companionship as you offer to him. However, if there is anyone, in whose heart the Quran has not entered, you cannot compel him to stay with you.

There is no control in love; because it lights an inner fire Ghalib;
It can't be lit from outside nor can it be extinguished from outside!

But you should continue your efforts so that the inner fire that is burning in your heart may also start a fire in his heart as well.

Day of accountability

My dear friends, there is one more important question worth pondering. You gather every year in these conventions. The question is: what is the purpose? There is no doubt that people benefit from exchanging ideas; that they benefit from networking and creating bonds of friendship; that they benefit from understanding the Quranic perspective on various aspects of life. These are very laudable objectives. But the basic goal of these conventions is something else – which is that these conventions serve as a Day of Accountability or یوم الحساب (*Yaumul Hisaab*). This means you have to assess yourself. You have to assess: to what extent the decision made at the prior convention has been achieved; to what extent the program action that was decided upon has been given practical shape; that to what extent the agenda that was agreed upon has been completed. If you did this kind of accountability then you accomplished the goal of the convention. If you didn't do this then this gathering is no more than a crowd of believers. If after the accountability, if you moved one step ahead with program of action then you will be counted among live human beings, and our destination will get nearer. And we can be hopeful that we will reach our destination one day: ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْمُبِيْنُ (45:30) – This will obviously be a

great achievement! On other hand, if we see that we are standing at the same place that we were standing last year – then this will be like the state of lifeless stones, not the state of living human beings. There is no difference between being static and being dead. In the words of Allama Iqbal:

Incessantly moving ahead is sign of life;
Remaining in the same state is not life;
If your tomorrow is the same as today;
You are only clay without the fire of life!

But, God forbid, if you are in a state of life which is behind compared to last year – then the Quran's judgment is: ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ (95:5) – Then We return him to the lowest of the low state. What can we say about such a state except to say?

Ask his heart and soul whose destination today;
Is far farther than what it was only yesterday?

Therefore my dear friends, do your accountability in this gathering. And find out from the Quran whether you are to be counted among the live human beings or among the dead stones or the lowest of the low. In fact, you should do this accountability at every step of your way. Life in fact means that one should incessantly engage in accountability. If you don't do what you say you will do then you are doing poetry with life: وَاَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ (26:226) – And the biggest difference is that their own lives are not according to what they say. They themselves do not act upon their own words. But more serious than this will be your warped psychological condition if you want praise for something that you don't do: وَّيُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا (3:188) – They like to be praised for what they did not do.

My dear friends, if this is the case then it is self-deception as well as God-deception. This must not be the case with an organization which claims to spread the Quran's message. The proof of the claim of its message should be the living results of its deeds. Please remember! In the scale of Allah the weight is of deeds not of talks. Simply talking is nothing but poetry which is unbecoming of a caller to a revolutionary message. The reality of this is the proclamation of the Quran: وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ (36:69) – We neither taught such poetry to Our Messenger, nor is it worthy of a person who has been assigned to deliver such a revolutionary and vital message.

So, please always keep in front of you the revolutionary message that you have committed yourselves to – and then think how great is this responsibility that you have undertaken and how precious is your every breath of life for this purpose? Please also note that it is only your movement – consisting of a small band of devotees – that has risen to deliver this Quran's revolutionary voice on

the face this Earth. The eyes of the world are set on you to see as to when the bold claim – that the solution of humankind's problems and suffering is with you – is going to be realized in practice. Research scholars from America and Europe come to me and when I present the idea of the Quranic system to them then I see a glow in their eyes. They become very thankful about it. But with subtle hesitation they say that who knows this system could be implemented in these times? When I tell them that we are trying very hard for it then their last words before departing are: we will be watching very carefully your efforts in this direction! From this you can very well imagine, my dear friends, what this responsibility is that you have undertaken on your shoulders; and how important it is to fulfill our claim? In your efforts lies the future welfare of entire humanity. If you shirk *this* responsibility then please think of how great a crime this will be considered in the court of Allah? Therefore, please put your heart and soul into this effort of spreading this message. It should not be the case that the destiny of humankind linked with enlightened hope of your efforts should become disillusioned and start crying in sadness and agony:

The smile came to us after a long time of fear;
But it was so bitter that it brought out bitter tears!

My dear friends, whatever I had to say I have said. This year my address to you is little short. This is because whatever details are needed about the Quranic constitution I will provide that in the open forum.

At this time, let me express my heartfelt thanks to you that you decided to participate in this gathering despite facing hardships of travel. As I have mentioned before, your arrival here for this gathering turns my solitude into joy of companionship – and this increases my age and my desire to live longer! May Allah increase the depth and breadth of your love and sincerity! And the purpose that you have undertaken in this journey, May the cosmic forces be your partner in this mission! My condition is that every breath of my life is spent in waiting for the establishment of this universal Quranic sustenance which guarantees that humanity will find its lost paradise once again. All night and day I call upon this lost paradise to arrive as soon as possible.

Do come on the shoulders of my restless hopes and aspirations;
I have been watching for a very long time; for your striding way!

I am sure that your beautiful wish is also included in this, my innocent wish.

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ۖ إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿١٢٧﴾

O our Sustainer! Accept our humble efforts because you are fully aware of what we speak and what is hidden in our hearts. (2:127)

4- وہ دائرہ اسلام سے باہر چوٹی کے حکماء اور فُضلاء کو ذہن میں رکھیں کیونکہ یہی لوگ ہیں جن کے قائل ہونے سے دنیا کی ذہنی فضا سے باطل تصورات کا اثر زائل کیا جا سکتا ہے۔

5- وہ علمی دنیا کے مسلمہ حقائق سے آغاز کر کے ان قرآنی حقائق کی طرف آئیں جن کی صحت لوگوں کے نزدیک مسلم نہیں۔

6- کسی غلط عقیدہ کی محض نفی مخالفین کو قائل نہیں کر سکتی جب تک اس کے مقابل کے صحیح تصور کا اثبات نہ کیا جائے۔

7- وہ ایک فلسفہ یا ایک فلسفیانہ خیال کی تردید کے لئے جن تصورات کو صحیح سمجھ کر کام میں لائیں تو کسی دوسرے فلسفہ یا فلسفیانہ خیال کی تردید کرتے ہوئے اسے غلط قرار نہ دیں۔ بلکہ اپنے موقف پر قائم رہیں۔

8- مغرب کے صحیح تصورات کو نہ تو رد کریں اور نہ ہی ان کے غلط تصورات کو قبول کریں۔

9- ہر غلط فلسفہ کے اندر وہ جن تصورات کو صحیح سمجھیں انہیں دوسرے فلسفوں کی تردید کرتے ہوئے غلط قرار نہ دیں اور جن تصورات کو غلط سمجھیں، انہیں دوسرے فلسفوں کی تردید کرتے ہوئے صحیح قرار نہ دیں ورنہ وہ اپنی تردید خود کریں گے۔

(3) ڈاکٹر برہان احمد فاروقی کا موقف:

1- کسی علمی صداقت کے ساتھ متصادم نہ ہو بلکہ ہر زمانہ میں تمام علمی صداقتوں کے ساتھ پوری طرح سے ہم نوا اور ہم آہنگ رہے اور جوں جوں علمی صداقتیں منکشف ہوں وہ اس کے اندر سماتی چلی جائیں۔

2- جس کے تمام تصورات ایک دوسرے کے ساتھ عقلی ربط وضبط رکھتے ہوں اور ایک دوسرے کی عقلی تائید اور توثیق کرتے ہوں۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہو سکتا ہے جب اس کے تمام تصورات قرآن کے بنیادی تصور کے ساتھ عقلی طور پر متعلق ہوں۔

3- جو تمام باطل فلسفوں کی موثر تردید کرتی ہو۔

4- جو کائنات کا ایک مکمل فلسفہ ہو اور حقیقتِ انسان و کائنات کے اہم مسائل کے بارے میں عملی راہ نمائی کرتی اور صداقت اور سچائی کا راستہ بتاتی ہو۔

5- جو علمی تصورات کی خامیوں کو آشکار کر کے انہیں پاکیزہ اور شُستہ بناتی ہو۔

6- جو ہمیں احکامِ دین کی حکمتوں اور علتوں کے پورے سلسلہ سے آگاہ کرتی ہو اور ان حکمتوں اور علتوں کا ایک ایسا تصور دیتی ہو، جس میں اندرونی طور پر کوئی تضاد نہ ہو۔

(اشاعت کے لئے محترم ڈاکٹر انعام الحق نے تعاون کیا ہے۔)

PUBLISHED SINCE 1938 AT THE BEHEST OF ALLAMA IQBAL[R] AND QUAID-E-AZAM[R]

CPL.NO. 28
VOL.77
ISSUE
10

Monthly
TOLU-E-ISLAM

25-B, Gulberg 2, Lahore, Pakistan
Phone. 042-35714546, 042-35753666
E-mail:idarati@gmail.com Web: www.toluislam.org
www.facebook.com/idaratolueislam1/ www.youtube.com/idaratolueislam

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ ۭ وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝۲۵۴ (سورۃ البقرۃ، آیت نمبر 254)

اے جماعت مومنین! انبیائے (علیہم السلام) سابقہ اور اقوامِ گزشتہ کے یہ تمام احوال وکوائف اس لئے بیان کئے گئے ہیں کہ تمہیں معلوم ہو جائے کہ زندگی کی خوشگواریاں حاصل کرنے کا راز نظامِ خداوندی قائم کرنے میں پوشیدہ ہے۔ اِس کے لئے ضروری ہے کہ تمہیں جو کچھ بھی خدا نے دیا ہے، اُسے اِس مقصد کے لئے کھلا رکھو۔ اِس وقت تم ایسا کرنے پر قادر ہو لیکن اگر یہ وقت ہاتھ سے نکل گیا تو پھر (دنیا اور آخرت کی) اِن خوشگواریوں کا حصول ممکن نہیں ہوگا۔ اِس لئے کہ یہ وہ جنس نہیں جسے تم جس وقت چاہو بازار سے خرید لو۔ نہ ہی یہ کسی دوست سے اِحساناً مل سکتی ہے اور نہ ہی کسی کی سفارش سے حاصل ہو سکتی ہے (2:48)۔ جو اِس حقیقت سے انکار کرتا ہے، وہ اپنا نقصان آپ کرتا ہے۔

(مفہوم القرآن از پرویز علیہ الرحمہ)